TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

ہمایوں

سالگرہ نمبر ۱۹۳۸ء

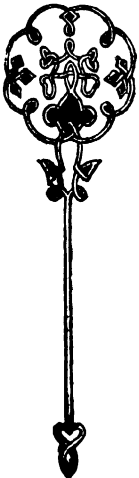
بیادگار عمدۃ الفصحاء آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر۔ بشیر احمد بی۔ اے (آکسن)

بیرسٹرایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں





سیفو



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ جنوری ۱۹۳۸ء

تصاویر (۱) گھرکی (۲) حسنِ فطرت (۳) مصر کی ایک بیوپار-
-گاڑی (۴) خوشی (۵) مشاعرۂ بزمِ اُردو شملہ

چندہ سالانہ مع سالگرہ نمبر صہ۔ ششماہی سے (مع محصول)　　قیمت سالگرہ نمبر ۱۲؍

کلامِ ہُمایوںؔ

پیغامِ عمل

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہوں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دین دار ہو

بہتر ہے گر عمل سے عقیدہ ہُوا کرے
ایسے سبق ہمیں نہ پڑھایا کرے کوئی

ہمایوں! تیرے مدفن پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم؟
یہاں حُسنِ عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

حضرتِ ہُمایوںؔ (مرحوم)

بزمِ ہمایوں

کم از کم آج کل کی دُنیا میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہمیں یہ بتاتا اور سکھاتا ہے کہ زندگی میں ترقی کشمکش سے ہے۔ یہ بات اب ہر کہ و مہ کی زبان پر ہے کہ زندگی نام ہے جدوجہد کا۔ بلکہ بعض تو لگی لپٹی چھوڑ کر صاف صاف صرف یہی نہیں کہتے کہ صلح چاہتے ہو تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ مسولینی کی طرح ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ جنگ زندگی کی ترقی کے لئے لازم ہے۔ یہ بات دُرست ہو نہ ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں جمود آیا، وہاں زندگی غائب ہوئی اور ترقی کے معنی ہیں عمل اور ردِّ عمل اور پھر عمل اور پھر ردِّ عمل!

یہ بات ہماری زبان اُردو پر بھی خوب صادق آتی ہے۔ ایک زندہ زبان جو ہندوستان بھر میں سمجھی جائے اور جا بجا بولی جائے، صاف ستھری، نکھری ہوئی، دلکش اور اَور دلکشی پانے والی، وسیع اور اَور وسعت پا سکنے والی، صحیح معنوں میں ملک کی قومی و ملکی زبان لیکن کبھی کبھی جوا سے جھپکی سی آگئی تو ہندی والوں نے آکر اسے جھنجھوڑا اور جگایا اور پھر ذرا اُونگھنے لگی تو پھر اُن بے چین ترقی والوں نے اسے آچھیڑا۔ خبر یار سے چھیڑ چلی جائے اسد۔ دن ہارے سونا بُرا ہے خواہ وہ کسی شیر کا سونا ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اُردو کا شیر پھر دہاڑ رہا ہے!

اُردو کو اگر ہندی بعض جگہوں سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہے اُردو کو اگر بعض ہندو چھوڑنے میں مصروف ہیں تو اس میں زیادہ حرج نہیں۔ اُردو میں اور ہندو مسلمان اُردو والوں میں اگر جان باقی ہے اور یقیناً جان باقی ہے اور وہ مصروفِ عمل ہے اور اَور زیادہ مصروفِ کوشش ہونے والی ہے پھر اس حال میں ایسی بناوٹی مخالفت سے مطلق نہ گھبرانا چاہیے۔ یہ مخالفت ہمارے لئے ایک موقع ہے اپنے عمل کے لئے اور آخرکار ایک زیادہ صحیح باہمی موافقت کے لئے۔

پچھلے دو سال میں اُردو کی دُنیا میں جو اہم واقعات ہوئے اُن کی مختصر ڈائری یہ ہے:۔

قبل ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۶ء میں : گاندھی جی کی کوششیں ہندی کے لئے اور اُردو کے خلاف

۱۲ راپریل ۱۹۳۶ء	: اُردو اجلاس۔ انجمنِ حمایت اسلام لاہور
۲۴ر " "	: بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا اجلاس (جس میں ہندی اتھوا ہندوستانی کا شگوفہ چھوٹا)
۸ رمئی "	: انجمن اُردو پنجاب کا قیام۔
۲۴ر اکتوبر "	: آل انڈیا اُردو کانفرنس علی گڑھ
۱۹۳۷ء	: گاندھی جی کی کوششیں بدستور ہندی کے لئے اور اُردو کے خلاف مصالحانہ رنگ میں۔
مارچ ۱۹۳۷ء	: ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں شعبۂ اُردو کا اجلاس۔

۴؍ اگست ۱۹۳۷ء : پنڈت جواہرلال نہرو کا رسالہ "زبان کا مسئلہ" شائع ہوا۔

۲۰؍ " " : بہار کمیٹی کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور راجندر بابو کا مشترکہ بیان

۱۷ اکتوبر " آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ کی قرارداد زبان کے متعلق۔

اِن واقعات کے ساتھ ساتھ اُردو ہندی لیڈروں کی تُو تُو میں میں برابر جاری رہی۔

گاندھی جی کی کارروائیوں کو دیکھ کر بابو سندر لال جی نے ایک خط اُن کے نام لکھا جس میں اُن پر واضح کیا کہ اُردو اکثر ہندوؤں کے گھر کی زبان ہے اور وہ ہندی جسے گاندھی جی اور بعض اور ہندو لیڈر رائج کرنا چاہتے ہیں فقط ایک کتابی اور تصاویری زبان ہے جو کہیں بولی سمجھی نہیں جاتی۔ سید محمود کے جواب میں پنڈت جواہرلال نے لکھا کہ زبان کے سوال کو خواہ مخواہ ایک فرقہ وارانہ سوال بنا لیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا کہ خود میری زبان اُردو ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کی "اُردو ہندی" کے مقابل میں مولانا ابوالقاسم نے اپنی ٹھیٹ اُردو کی لکھت رکھ دی اور پھر اپریل ۱۹۳۷ء میں مہاتما جی سے بھی ایسی ہی دو دو ٹھیٹ باتیں کر کے اُردو کے تیس صفحوں اور ناگری کے سو صفحوں میں لکھوا کر پیش کر دیں۔ ابھی دو ماہ ہوتے اس "ہندی کی چندی" کی آخری لاجواب قسط مولانا نے پھر ڈاکٹر صاحب کے نام نشر کی ہے۔ انہوں نے اپنے انیکتا، کولاہل، رکشا، سمبندھ، دشا کی بابت لکھا تھا کہ ہماری طرف کے ہر شہر اور گاؤں میں لوگ انہیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے الہ آبادی ہندوؤں سے پوچھا تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے کہ ہم نے یہ شبد نہ کبھی دیکھے نہ سُنے۔ مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بتا کر پوچھا ہے کہ آخر جیسی اُردو ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۵ء میں لکھتے تھے کیا مصیبت آ پڑی کہ اُس کی جگہ اب وُہ ایک جناتی سی زبان لکھنے لگے۔ اب "مقصد" کی جگہ کیوں "اُدیش" نے لے لی؛ آخر میں مولانا نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایک کمیٹی ہندو مسلمانوں کی بنائی جائے جس میں فریقین ایک دوسرے کے مشکل لفظوں کی جگہ آسان عام فہم لفظ تجویز کریں اور یوں ایک قومی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے زبان کے مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ گو بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے مگر مولوی عبدالحق صاحب نے خوب لکھا ہے کہ پنڈت جی بھی ہندی والوں کے ہنگامے سے متاثر ہیں اس کے علاوہ یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف وہ بارہ زبانیں ہی زبانیں سمجھنی چاہئیں جو نہرو صاحب نے گنوائی ہیں۔ نہ یہ درست ہے کہ اُردو شہروں کی اور ہندی دیہات کی زبان ہے۔ اور اصطلاحوں کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو کی کتابیں لازم ہے کہ اُردو کے ادیب ہی تیار کریں ورنہ خواہ مخواہ زبان خراب ہو جائے گی اور تنبیہ کی ہے کہ دیہاتیت کی قربان گاہ پر ملک کی ترقی کو بھینٹ نہ چڑھا دینا چاہئے۔

جناب سکرٹری صاحب انجمن ترقیٔ اُردو مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے گذشتہ سال میں مدراس اور ملیبار اور بہار اور ناگپور اور لکھنؤ اور کئی اَور مقامات کا دَورہ کر کے ہر جگہ اُردو کی بنیادیں مضبوط کیں۔ مانا کہ ہندی والے روپے پیسے والے ہیں اور اُردو والوں کے ہاں چند پھوٹی کوڑیاں ہی ہیں لیکن دُنیا دیکھے گی کہ اُردو اور اُردو والوں کے دل کھرے ہیں اور اگر قدرت کو ہمارے وطن کی بہتری منظور ہے تو یہ ملکی ترقی کی ترازو میں ضرور پورے اُتریں گے۔

انجمن اُردو پنجاب نے بھی اپنی بساط کے مطابق پچھلے پونے دو سال میں کچھ نہ کچھ کام کیا - کم از کم ۲۲ جلسے ہوئے اور ۳۲ بار ریڈیو پر تقریریں بھی ہوئیں - علاوہ بریں اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے اور مذاکرے اور مختلف اُردو مساعی ہوتی رہیں - آئندہ کے لئے ارادہ ہے کہ اُردو کا عوام سے ایک زیادہ گہرا تعلق پیدا کیا جائے اور انشا پردازوں کو بیش از پیش موجودہ تحریکات کی طرف متوجہ کیا جائے -

پچھلے سال ہمارے ملک میں جو اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئی ہیں اُس کا ہمارے ادب پر نمایاں اثر پڑا ہے - کئی ادیب ادب کا چولا اُتار کر سیاست کے میدان میں اُتر آئے ہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں - نپولین نے جب جرمنی پر حملہ کیا اور وہاں کی قومی زندگی میں ایک ہلچل مچ گئی تو کئی جرمن ادیب ادب کو چھوڑ کر سیاست میں حصہ لینے لگے - ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہمارے ادیب اُردو سے دامن چھڑا کر اپنے گلے سے صرف سیاسی پھندا اٹکا لیں کیونکہ ادب بھی آخر ملکی و انسانی زندگی کا ایک مظہر ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جب ملک کی تمام زندہ قومیں اُس کے سیاسی محاذ پر جمع ہو رہی ہیں ادیبوں کا اپنی قوم کے نعرے پر لبیک کہنا مناسب و موزوں ہے - ہاں یہ ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ اس سے غیر جانبدار ادب کا پاکیزہ دامن کسی سطحی اور ناصاف سیاست سے آلودہ ہو جائے - ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُردو کے علمی و ادبی رسالے "کانگرسی" اور "لیگی" اور "اتحادی" بن رہے ہیں - خدا کرے یہ سب قوم کے مختلف فرقوں کو یگانگت کی راہ دکھائیں اور اُس سرد مزاجی اور معقولیت سے کام لیں جو سچے ادیبوں کی شان کے شایاں ہو -

ہمایوں کے صفحات ہمیشہ ہر خیال کے ادیبوں کی معقول جولانیوں کے لئے کھلے ہیں - زبان کے معاملے میں ہمایوں رواداری ہے لیکن اُردو کی نگہداشت کرنے میں اُس کا اعتقاد ہے کہ "وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے" اگر اُردو رسالے ہی عملی طور پر اُردو کی حمایت نہ کریں گے تو اُنہیں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں - اس کے علاوہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اُردو اور صرف اُردو ہی ہندوستان کی ملکی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے ؛ یہ درست ہے کہ حاسد مخالفین فضول خاک اُڑا رہے ہیں لیکن "کہیں خاک ڈالے سے چھپتا ہے چاند ؛" البتہ ہندوستان کی دوسری زبانیں اس چاند کے ساتھ تارے بن کر چمکیں تو ہمارے سر آنکھوں پر!

گزشتہ سال ہمایوں میں "پنجاب میں بہن کے ترانے" اور لالہ طور کے ہندی ترجمہ "کیلاش کنول" کی اشاعت سے ہمارا رویہ صاف ظاہر ہے - پنجاب کی علمی و تمدنی زبان اُردو ہے بہت سے پنجابیوں کی بولی پنجابی ہے - اور ہندی اُردو کی چھوٹی بہن ہے - اُردو کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ اگر یہ زبانیں اپنی اپنی فطری اور مخصوص جگہوں میں کام کرتی رہیں تو اُردو اور یہ سب کی سب، اُردو کی رہنمائی میں، ملک و قوم کی بڑی خدمت سر انجام دے سکتی ہیں -

بشیر احمد

جہاں نما

۱۹۳۷ء کے اہم واقعات یہ تھے :-

یکم جنوری :- جناح کی اپیل ہندو مسلم اتحاد کے لئے۔

۲۴ " :- فرانس اور ترکی کا سمجھوتا اسکندرونہ کے متعلق۔

۳۱ " :- ماسکو میں تیرہ ملزموں کو پھانسی کی سزا۔

:- کونسلوں کے انتخابات میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگرس کی فتح۔

۲۴ مارچ :- حبشہ میں اطالویوں کے ہاتھوں چھ ہزار باشندوں کا قتل۔

یکم اپریل :- نئے دستور کے نفاذ پر ہندوستان میں ہڑتال۔

۱۲ مئی :- شاہِ انگلستان کی تاج پوشی۔

۲۷ " :- مصر لیگ کا رکن بنا۔

۱۲ جون :- کمال اتاترک نے اپنی ساری جائداد قوم کی نذر کر دی۔

۲۴ " :- فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔

۷ جولائی :- کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

۳۱ " :- انڈمان کے قیدیوں کی بھوک ہڑتال۔

۴ اگست :- گاندھی جی کی وائسرائے سے ملاقات۔

۹ " :- جاپانی فوجیں پیپنگ میں داخل ہوئیں۔

۳۰ " :- چین اور رُوس کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ ہوا۔

۱۹ ستمبر :- امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ دوسری قوموں کی لڑائی میں حصّہ نہ لے گا۔

۲۶ " :- مسولینی اور ہٹلر کی ملاقات۔

۴ اکتوبر :- انگلستان اور فرانس نے اطالیہ سے درخواست کی کہ وہ سپین سے اپنے رضاکار واپس بلالے۔

۶ " :- لیگ کمیٹی نے رپورٹ کی کہ جاپان چین پر زبردستی کر رہا ہے۔

۱۵ " :- آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔

۵ نومبر :۔ اطالیہ اور جرمنی اور جاپان نے آپس میں ایک معاہدہ کیا۔
۲۸ " :۔ فرانسیسی وزیروں نے لندن میں آکر برطانیہ سے بین الاقوامی حالات کے متعلق گفتگو کی۔
۲۹ " :۔ گائے کی حفاظت کے لئے ایک آل انڈیا نسوانی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔
۱۰ دسمبر :۔ جاپانیوں نے چینیوں کو زبردست شکستیں دے کر نانکن کو فتح کر لیا۔

اس نقشے پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے قابلِ غور اور اہم ترین واقعات یہ ہیں:۔
ہندوستان میں کانگرس کی کامیابیوں کی وجہ سے ایک نئی صورتِ حالات پیدا ہو گئی ——— فلسطین کی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق فلسطین کی مجوزہ تقسیم سے ساری اسلامی دُنیا میں ہلچل مچ گئی۔ ——— جاپان نے دُنیا بھر سے بے پروا ہو کر چین پر دھاوا بول دیا ہسپانیہ میں اشتراکیت اور فاشیت کی جنگ شد و مد سے جاری رہی۔ ——— دولِ عظمےٰ کے دو بڑے گروہ بن گئے، ایک طرف جرمنی اطالیہ اور جاپان اور دوسری طرف رُوس فرانس اور غالباً انگلستان۔ ——— اور حسد رقابت خود غرضی اور شیطنت کی تاریکیوں میں ایک نئی آنے والی جنگِ عالمگیر کی بجلیاں دُور افق پر چمکنے لگیں۔

اب مختلف ملکوں پر نظر ڈالو کہ اُن کا کیا حال رہا؟
انگلستان اپنے نئے بادشاہ کو تخت پر بٹھا کر اپنی وسیع سلطنت کے بچاؤ کے لئے جوڑ توڑ کرتا رہا۔ کبھی اطالیہ سے گفت و شنید کبھی جرمنی سے بات چیت، کبھی فرانس سے صلاح و مشورہ اور اندر ہی اندر خدا جانے کس کس سے کیا باتیں مگر سب کا مدعا صرف اِک یہی کہ کسی طرح بغیر لڑے برطانوی سلطنت قائم رہے۔ غالباً انگلستان جرمنی کو چند نو آبادیات دینے پر کم از کم دل میں راضی ہو چکا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اِک عرصے سے انگریزوں کی قومی حکومت میں کمزوری اور خوف و ہراس کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور جنگی تیاریاں محض مجبوراً کی جارہی ہیں۔ انگلستان کی سلطنت اتنی وسیع اور اُس کی ذمہ داریاں اتنی سخت ہو گئی ہیں کہ انگلستان کی حکمتِ عملی مضبوط اصُول پر قائم نہیں رہی۔
فرانس انگلستان سے بھی زیادہ بزدلی سے کام لے رہا ہے۔ دقت یہ ہے کہ فرانس میں حسبِ معمول پارٹی بازی جاری ہے اور گو وہاں کی حکومت آج کل اشتراکی ہے لیکن ساڑھے چار کروڑ میں سے دو کروڑ باشندے اشتمالیت کے سخت مخالف ہیں۔ اس اختلاف سے قومی طاقت میں ضعف پیدا ہو گیا ہے۔
رُوس میں اشتمالیت کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور گو گاہے گاہے عجیب و غریب سازشوں کا انکشاف ہوتا ہے اور حکومت جبر و تعدی پر بھی اُتر آتی ہے لیکن دسمبر ۱۹۳۶ء کے نئے جمہوری نظام کے نفاذ نے جس میں فرد کی آزادی اور دیہاتیوں کے حقوق کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے حکومت کو اندرونِ ملک میں اور متمدن دُنیا میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ ۲ کروڑ گھرانے مشترکہ قطعاتِ ارضی میں جن کا رقبہ ۲۸ کروڑ ایکڑ ہے حصّہ دار ہیں۔ چند ماہ ہوئے ایک

پادری نے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ رُوس کی تہذیب محض مادی ہے غلط ہے۔ مثلاً وہاں یہ خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی زیادہ جنسیت پرست ہو یا غلیظ رہے۔ بدکاری کا پیشہ نام کو باقی نہیں رہا۔ مرد عورت کے تعلقات شریفانہ ہیں، خاندانی زندگی مضبوط ہے، بچوں سے لگاؤ ہے، نوجوان صفائی پسند ہیں۔ رُوس کے اخلاق کی بنا اس کی جدوجہد پر ہے کہ انقلاب اعتماد کے بغیر نہیں چل سکتا اور رُوسیوں کا خیال ہے کہ انقلاب کے بعد بھی انسانی فطرت کی قدرتی نیک روش سے بھلائی پر قائم رکھے گی۔ رُوس میں شادی رجسٹری کے ذریعے یا فریقین کی رضامندی سے ہو سکتی ہے۔ ناجائز بچے ناجائز نہیں سمجھے جاتے لیکن اس کے باوجود ان کی کثرت نہیں ہے۔ البتہ نئی آزاد طرزِ زندگی کی وجہ سے رُوسی سوسائٹی میں بھی کئی خرابیاں موجود ہیں جن کا خود رُوسی فسر کرلینگو نے اپنے ایک مقالے میں اعتراف کیا ہے اور رُوسیوں کو تنبیہ کی ہے کہ انہیں دُور کریں۔ رُوسی حکومت کم از کم اپنے نظام کی بعض کوتاہیوں کو نہیں چھپاتی کیونکہ اُس کی رائے میں اُن کا چھپانا رُوس میں اشتراکیت کو بجائے مضبوط کرنے کے کمزور کر دے گا۔ رُوس امن پسند ہے لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر وہ جنگی تیاریوں میں دن رات مصروف ہے۔ اس وقت فوج کی تعداد ۱۳ لاکھ ہے اور اس کے علاوہ ایک کروڑ سپاہی بوقتِ ضرورت طلب کئے جا سکتے ہیں۔ رُوس کی ہوائی طاقت زبردست ہے۔ ہوابازی بہت ہر دلعزیز ہے۔ ۳۶ء کے پہلے چھ ماہ میں ۱۰،۵۰۰ غیر فوجی ہوائی جہازوں سے نیچے کُودے۔ فوجی ہوابازوں کی تعداد اس وقت ایک لاکھ ہے۔

امریکہ میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مخالفت کے باوجود پریذیڈنٹ رُوزولٹ کا انتخاب عوام کے جمہوری خیالات کی کامیابی کا مظاہرہ ہے۔ رُوزولٹ "بھولے بسرے آدمی" کا محافظ اور صحیح قسم کی جمہوریت کا علمبردار ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں امریکی حکمتِ عملی اُلجھن میں پڑی ہے۔ اِدھر وہ کسی جنگ میں حصّہ لینا نہیں چاہتی اُدھر جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت اُسے اور مسلح اور مضبوط ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔

جرمنی میں شہری آزادی کا جنازہ کبھی سے ہٹلر کے کندھوں پر نکل چکا ہے۔ قیدی باڑوں میں معمولی قصور کی بنا پر موت کی سزا مل سکتی ہے۔ مشہور جرمن مصنف ایمل لڈوگ نے حال میں لکھا ہے کہ سارے اعلےٰ جرمن مفکروں کو دیس نکالا دیا جا چکا ہے اور جرمن آزادی کی روایات کا باقاعدہ قلع قمع کیا گیا ہے۔ جرمن بچوں میں کس طرح فوجی خیالات ٹھونسے جاتے ہیں اس کی ایک مثال جرمن سکولوں کی ایک حساب کی کتاب میں دیکھو جس میں ایک یہ سوال درج ہے کہ جنگِ عالمگیر میں جرمنی اور اس کے حلیفوں نے ۱،۰۰،۰۰،۰۰۰ سپاہی تیار کئے اور جرمنی کے دشمنوں نے ۴،۰۰،۰۰،۰۰۰۔ بتاؤ کہ جنگ کے محاذ پر جرمنوں کے ہر دس سپاہیوں کو کتنے اتحادیوں کا سامنا کرنا پڑا؟ یورپ میں جرمنی مرکزی اور مشرقی یورپ میں اقتدار بڑھانا اور سپین سے خام پیداوار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یورپ سے باہر وہ اپنی کھوئی ہوئی نو آبادیات پھر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آسٹریا اس کے زیرِ اثر ہے۔ چیکوسلووکیا اُس سے ڈر رہا ہے۔ انگلستان گا ہے گا ہے اُس کے ساتھ ساز باز کرتا ہے اور اطالیہ اور جاپان کے ساتھ اتحاد ہونے کی وجہ سے اُس کی قوت اور رُعب میں واقعی خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ رُوس پر علانیہ دانت پیس رہا ہے۔ لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ یہ محض گیدڑ بھبکیاں ہیں اور جرمنی کی اندرونی حالت اچھی نہیں!

اطالیہ حبشہ کو ظلم و تعدی سے دبا رہا ہے۔ سپین میں وہ فاشیت کا جھنڈا اُڑا رہا ہے اور بحرِ روم میں اپنی بحری و ہوائی طاقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ اور جرمنی دونوں کا ایک سا حال ہے۔ دونوں کے ہاں ملکی آزادی مفقود ہے لیکن باہر دُنیا میں وہ خوب آپ اپنا ڈنکا بجا رہے ہیں اور دوسروں کی خوشحالی کو دیکھ کر چلاتے ہیں کہ ہم جب چین سے بیٹھیں گے اور بیٹھنے دیں گے کہ اس صدیوں کی لُوٹ

مار میں سے جس پر آج آپ امن اور شائستگی کے ساتھ قابض ہیں ہمیں بھی حصّہ دیا جائے۔

جاپان اب اس قدر طاقتور ہے کہ اُسے کسی کی پروا نہیں۔ وہ اطالیہ اور جرمنی کا ہم خیال ہے اور حلیف۔ یُورپ دُور اپنے مناقشات میں غرق ہے یہ ادھر جاری بھر کم چین کی گت بنانے میں مصروف ہے۔ وہ کم از کم مشرقی ایشیا کا راہنما اور حاکم بننا چاہتا ہے۔ جاپان نے یہ طاقت بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ جاپان کے ۹۹ فی صدی بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مشرق سے اور مغرب سے جو کچھ بھی جاپانی سیکھ سکتے ہیں وہ سیکھنے میں مصروف ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں طلبہ سال میں تقریباً ۱۵۰ دن سکول جاتے ہیں جاپان میں ۲۲۰ سے لے کر ۲۴۰ دن تک اُن پر بوجھ اتنا ہے کہ سال بھر میں ۳۰۰۰ جاپانی طلبہ خودکشی کرتے ہیں مگر اس پُرہمت قوم کو اس قربانی کی پروا نہیں۔ پچھلے سال میں اس جفاکش منگنی قوم نے ورزش اور ریاضت سے اپنا قد اوسطاً ایک انچ بڑھا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اس قوم کا کوئی دوسری کالی گوری یا پیلی قوم مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جاپانی جانتے ہی نہیں کہ سردی، بھوک یا تھکان کیا چیز ہے۔ حیف ہے کہ ایک ایسی عظیم الشان قوم ایک کمزور پڑوسی کو اپنے پاؤں تلے روندنا اپنے لئے باعثِ ننگ نہ خیال کرے!

چھوٹی قوموں میں تُرکی نہایت استقلال کے ساتھ اپنے کمال کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اور کمال کی دُوراندیش حکمت نے افغانستان ایران اور عراق کے ساتھ مل کر اسلامی ریاستوں کے ایک ایسے اتحاد کی بنیاد رکھی ہے جس سے اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر جمع ہو رہا ہے۔

فلسطین کی مجوزہ تقسیم نے اسلامی دُنیا میں ایک ہلچل مچادی ہے۔ برطانیہ کی یہود نواز پالیسی نے یہودیوں کو دُنیا کے کونے کونے سے لاکر فلسطین کے ساحلوں پر لا ڈالا ہے اور اب دس لاکھ عربوں کے مقابل میں اُن کی آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے ملک کا زرخیز ساحلی حصّہ بیشتر یہودیوں کو بخش دیا گیا ہے۔ صحرائی علاقہ عربوں کی نذر کیا گیا ہے اور بیت المقدس کا علاقہ انگلستان کے تصرف میں رکھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ انگلستان کی شہنشاہیت کے لئے فلسطین کی بندرگاہیں اور ہوائی مرکز ضروری ہیں۔

چین کو اکیلا پاکر جاپان اُس پر جھپٹ پڑا ہے۔ چین اتحاد و تنظیم کا سبق پڑھ رہا ہے لیکن بہت دیر میں۔

ہندوستان کی پچھلے سال کایا پلٹ گئی ہے۔ کانگرس اب سات صوبوں میں حکمران ہے اور گو مسلمانوں کی اکثریت اُس کے ساتھ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُس نے شہنشاہیت کا زور توڑنے اور ایک جمہوری سی حکومت قائم کرنے میں بڑا بھاری ملکی کام سرانجام دیا ہے۔

دنیا کا تمدن اس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ سیاسی اور معاشی اور معاشرتی اور اخلاقی تحریکات کی نئی روش دُنیا کو ایک اَور دُنیا بنا رہی ہے۔ جنگ کے بعد کئی چھوٹی قوموں کو آزادی کی نعمت ملی لیکن پچھلے چند سالوں سے طاقتور قوموں میں طاقت اور رعونت کا ایسا خبط سمایا ہے کہ کمزور قوموں کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ پہلے حبشہ مٹا اب چین مٹ رہا ہے کہیں چیکوسلوویکیا کا نمبر آ رہا ہے کہیں ترکی نئے ہتھیار خرید رہا ہے کہ مبادا کوئی بدد ماغ آ دھمکے۔ پھر ایک طرف اشتراکیت کی دھمکیاں دوسری طرف فاشیت کے دعوے ہیں اور پاس ہی جمہوریت اور شاہنشاہیت اپنی دلائل اور فریب کاریاں پیش کر رہے ہیں۔ اِن سب میں ایک عالمگیر نتیجہ خیز جنگ

منقریب ہونے والی ہے گو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ کا درصل کوئی بھی خواہاں نہیں اور چند بھوکی قومیں دوسری بیٹھو قوموں سے کچھ ہُو کر چپ ہو رہیں گی۔

عورت دُنیا میں روز بروز اقتدار حاصل کر رہی ہے۔ رُوس اس وقت عورت کے لئے فردوس بر روئے زمین ہے۔ اطالیہ و جرمنی کی عورتیں ضرور اس وقت گھاٹے میں ہیں لیکن سارے مشرقی ملکوں میں اُس کی محکومی جلد ختم ہونے والی ہے۔ ترکی میں اور ایک حد تک مصر چین اور ایران میں عورتوں نے مغربی وضع اختیار کر لی ہے۔ اُدھر جاپان اور ہندوستان کی عورتیں ابھی اپنے قومی شعار سے وابستہ ہیں گو وہ بھی اب اپنے قانونی اور انسانی حقوق پر اصرار کر رہی ہیں۔ مصر اور ایران کی عورتوں نے ملکی آزادی میں حصّہ لیا اور ۱۹۳۶ء میں شام میں تین سو عورتوں نے فرانس کے خلاف مظاہروں میں اپنی جانیں کھو دیں۔

نوجوان اکثر اشتراکی خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں اور نئی تعلیم و تربیت اُن کے دل و دماغ کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہی ہے۔ طلبہ کو اب سخت گیر اُستادوں کی ضرورت نہیں ہمدرد رہنماؤں کی حاجت ہے۔ نوجوان اب ذمہ دار بننا چاہتے ہیں، اُن میں جماعتی شعور پیدا ہو رہا ہے اُنہیں ایک نئے معاشری مذہب کی تلاش ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا پُرانا قانون پھر زوروں پر ہے۔ شخصی آزادی بعض ملکوں میں چھن گئی ہے۔ اشتراکیت و فاشیت کی خشمگیں موجودگی میں نرم و نازک جمہوریت کا حال پتلا ہو رہا ہے۔ دُنیا پر جنگ کی کالی گھٹائیں چھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ وہ ایک شیطانی بلا بن کر اس پر برس بھی پڑیں لیکن باوجود ان دل شکن حالات کے انسانیت کی رُوح بلند و سرفراز ہے۔ انسانیت کا دماغ مستقبل کے متعلق ایک دل خوش کُن نتیجے پر پہنچ چکا ہے اور انسانیت کی نظر اُس نئی دُنیا کی ایک جھلک دیکھ رہی ہے جو پُرانی دُنیا کی کشمکش کے اندر سے شاید ایک زبردست مصیبت خیز دھماکے کے بعد ایک نورانی ہستی کی طرح عالمِ وجود میں آنے والی ہے!

بشیر احمد



اشتراکیت

ہماری دُنیا کا تازہ ترین مذہب اشتراکیت ہے!

اِسے سُن کر اِدھر مذہب والے ناک بھوں چڑھائیں گے اور اُدھر اشتراکی لوگ بھی مُنہ پھیر لیں گے۔ اہلِ مذہب اِسے آسمانی مذاہب کی اِک توہین خیال کریں گے کہ ایک قسم کی دہریت کو مذہب کے نام سے پکارا جائے۔ اور اشتراکی اپنے نئے مسلک کے لئے مذہب کا لفظ کبھی پسند نہ کریں گے کیونکہ وہ مذہب کو بھی اُس سرمایہ داری کا ایک ڈھونگ سمجھتے اور کہتے ہیں جس کے خلاف وہ رات دن جہاد کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ اشتراکیت میں اشتراکیوں کا اعتقاد بالکل ایسا ہے جیسے کسی نئے مذہب میں اُس کے معتقدین کا، ایک اعتقاد جس پر وہ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں اور اس جنگ کو وہ اپنے اور دنیا کے لئے باعثِ سعادت خیال کرتے ہیں، جس کے خلاف وہ ایک لفظ سُن کر بھی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں جب ان باتوں کا مشاہدہ کیا جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ اشتراکیت نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ مذہب سچا ہے یا جھوٹا یہ دوسری بات ہے لیکن ہے یہ ایک مذہب!

اس نئے مذہب پر غور کرنا چاہئے کیونکہ اب یہ محض چند متعصب لوگوں کا دین نہیں رہا بلکہ اب اس کے پیرو کروڑوں کی تعداد میں دنیا کے تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اب اس مذہب کی حکمرانی اور عمل کا مظاہرہ دنیا کے ایک بڑے ملک اور ایک بڑی قوم کے ذریعے سے ہو رہا ہے۔ رُوس اشتراکیت کا منبع و مسکن ہے اور وہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ نئی تحریک کہاں تک کامیاب ہوئی اور کہاں تک ناکام رہی ہے؟ اُس کے نقص کیا ہیں اور اُس کی خوبیاں کیا ہیں؟

اشتراکیت کیا ہے؟ اشتراکیت کی بقول سٹریچی خود لینن نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ ہے ذرائع پیدائش کی مشترک ملکیت اور افراد کے کام کے مطابق پیداوار کی تقسیم۔ رسل اسے فقط زمین اور سرمایہ کی مشترک ملکیت کہتا ہے۔ اس مشترک ملکیت کی مالکہ یا تو ایک جمہوری مملکت ہو سکتی ہے یا لوگوں کی ایک آزاد انجمن جو مملکت سے اختیارات نہ رکھتی ہو یعنی "نراجی اشتمالیت"۔

اس مضمون کی تیاری میں منجملہ کئی پرانے اور نئے انگریزی اور اُردو مقالات کے مفصلہ ذیل کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

(1.) Russell: Principles of Social Reconstruction (1916), (2) Roads to Freedom (1919) (3) Cripps: Why this Socialism? (1934), (4) Jackson: The Post war world, (5) In praise of Idleness (1935), (6, Marxism (Pub: Chapman and Hall, (1935)), (7, Webb: Soviet-Communism (1936), (8) J. L. Nehru: India and the World (1936). (9) Strachey Socialism 1936, (10.) What is ahead of us? (Allen and Unwin, (1937)

بعض اشتراکیوں کا خیال ہے کہ مشترک ملکیت یک بیک ایک انقلاب کے ذریعے سے ظہور میں آسکتی ہے۔ لیکن بعض سمجھتے ہیں کہ یہ بتدریج پہلے صنعت وحرفت کے ایک محکمے میں آتی ہے پھر دوسرے میں۔ بعض اصرار کرتے ہیں کہ مشترک ملکیت کا ہمہ گیر ہونا لازم ہے۔ دوسروں کا خیال ہے کہ اس میں کہیں کہیں ذاتی ملکیت بھی رہ جائے تو حرج نہیں بشرطیکہ ایسی ملکیتیں زیادہ طاقتور نہ ہوں۔ لیکن اشتراکیت کی ان سب شکلوں میں جو دو چیزیں مشترک ہیں وہ ہیں جمہوریت اور موجودہ سرمایہ داری کے نظام کی کُلّی یا تقریباً کُلّی موقوفی۔

اشتراکیت اور اشتمالیت میں جو فرق ہے اُس کا شروع ہی میں سمجھ لینا ضروری ہے۔ بعض دفعہ یہ اصطلاحات ایک دوسری کی جگہ، بے سوچے سمجھے استعمال کی جاتی ہیں۔ لینن نے اپریل ۱۹۱۷ء میں اپنی جماعت کا نام تبدیل کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے یعنی بجائے اشتراکی کے اشتمالی کا نام اختیار کرتے ہوئے کہا کہ نوع انسان سرمایہ داری کے بعد اشتراکیت کی حد میں داخل ہوتی ہے لیکن ہماری جماعت کا مقصود اشتراکیت کی سرحد سے بھی پرے ہے۔ اشتراکیت کچھ عرصے کے بعد لازمی طور پر اشتمالیت میں تبدیل ہو کے رہتی ہے وہ اشتمالیت جس کے جھنڈے پر یہ مقولہ لکھا ہے "ہر ایک اپنی قابلیت کے مطابق دے اور اپنی ضروریات کے مطابق لے"۔

لوگوں کو عام طور پر غلط فہمی ہے کہ اشتراکیت کے معنی ہیں کہ دُنیا کی ہر چیز میں ہر شخص کا حصّہ برابر کا ہونا ہے، یہ موجودہ حالات میں نہ صرف ناممکن ہے بلکہ نامناسب بھی ہے مثلاً کسی کی صحت اچھی ہے کسی کی بُری، کسی کے ایک درجن بچے ہیں کسی کے صرف دو یا ایک، اب اگر ایسے اشخاص کی آمدنی برابر کر دی جائے تو یہ انصاف نہ ہوگا بلکہ ظلم۔ اس کے علاوہ اشتراکیت کی حالت میں معاشی یا مالی مقابلہ تو جاتا رہتا ہے لیکن ایک قسم کا ذاتی مقابلہ اُس کی جگہ لے لیتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے لئے ایک حد تک تشدّد کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ رُوس میں آج کل ایک ہی کارخانے میں ۸ سے لے کر ، ا قسم تک کی کم و بیش اُجرتیں مزدوروں کو اُن کی مہارت و قابلیت کے بموجب دی جاتی ہیں۔ ہر مزدور حق رکھتا ہے کہ بڑی سے بڑی اُجرت کا دعویدار بنے لیکن پھر اُسے اپنے دعوے کا اپنے عمل سے ثبوت دینا پڑتا ہے اور دکھانا پڑتا ہے کہ میں قابلیت کی بنا پر فوقیت کا حق رکھتا ہوں۔ یہ آزاد مقابلہ ہے برابری نہیں۔

اشتمالیت میں اشیاء اور آرام و آسائش کا سامان ہر شخص کی ضرورت کے مطابق اُسے دیا جائے گا اور وہ صرف اپنی طاقت یا قابلیت کے بموجب کام کرے گا۔ اس پر اعتراض ہوگا کہ کیا ہر شخص جو چاہے گا لے سکے گا اور جتنا کام چاہے گا کرے گا؛ ہاں بالکل ایسا ہی ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو موجودہ حالات میں یہ ہمیں فضول اور بے معنی معلوم ہوتا ہے ایسا ہونا قطعاً ممکن اور قابلِ عمل ہے صرف اس کے لئے پہلے بعض مادّی اور نفسیاتی حالات کا وجود میں آنا لازم ہے اور ان کا وجود میں لے آنا اشتراکیت کا کام ہے۔ ان میں ایک انسانی علوم وفنون کے ذریعے چیزوں کی بہتات یعنی اتنی بہتات کہ لوگوں کی ضرورت سے بہت زیادہ چیزیں مہیا ہو جائیں۔ پسینہ بہا بہا کر چار پیسے کمانے کی پُرانی عادت نے فی الحال انسان کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ سمجھ سکے کہ اتنی سخت محنت کی سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں کے اس زمانے میں ضرورت نہ ہونی چاہئے۔ دوسرے انسانی کاموں کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے کہ وہ بجائے ایک مصیبت کے باعثِ مسرت بن کر نظر آئیں اور زندگی کا لطف انسان کے لئے کام کرنے میں ہو جیسا کہ اب بھی مثلاً سائنس دانوں کو اپنے کام میں دماغی وروحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ حالات پیدا ہو جائیں گے تو اشتراکیت خود بخود اشتمالیت

کا جامہ پہن لے گی۔ ہم نے اپنے مضمون کا عنوان اشتراکیت اسی لئے رکھا ہے کہ ابھی دُنیا محض اشتراکیت سے دوچار ہو رہی ہے کیونکہ بقولِ لینن انسانیت کو سرمایہ داری کے بعد پہلے اشتراکیت سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جب جا کر کہیں وہ اشتمالیت کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔

یہ اشتراکیت جس کا آج کل اتنا شور مچا ہُوا ہے کیا یہ جنابِ لینن یا حضرتِ مارکس کی ایجاد ہے؟ کیا اس سے پہلے دُنیا نے کبھی اس لفظ کو نہ سُنا تھا؟ کیا انسان کا تخیل کبھی اس کی فضاؤں پر بہ پَروا نہ ہُوا تھا؟ کیا کسی جماعت نے کبھی اس عقیدے کو نہ مانا تھا یا اس پر عمل کرنے کی نہ ٹھانی تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ بیسیوں اَور چیزوں کی طرح اشتراکیت بھی ایک ایسا نظریہ اور نظام ہے جس کی بنیادیں ہم کو قدیم زمانے میں جا بجا ملتی ہیں۔

کہا گیا ہے کہ سقراط پہلا شخص تھا جس نے بڑھتی ہوئی انفرادیت کو روک کر عوام کو اشتراکیت کی ذرا سی جھلک دکھائی۔ وہ علم کو خیرِ محض اور ریاست کو ایک مقدس اجتماعی نظام سمجھتا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ افلاطون وہ پہلا مفکر تھا جس کے خیالات میں سب سے پہلے اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کے ایک باقاعدہ نظام کی بُنیاد پڑی۔ اُس کی مشہور "جمہوریت" ایک مثالی ریاست تھی جس کا واحد مقصد انسانی سعادت کا حاصل کرنا ہے۔ اس ریاست میں شخصی سرمایہ اور انفرادی ملکیت قانوناً ممنوع ہے بلکہ بچے اور عورتیں بھی ریاست کی مشترک ملکیت ہیں "ہر بچہ ہر شہری کا بچہ ہے اور ہر عورت ہر مرد کی بیوی"۔ اس سے بڑھ کر اشتراکیت اور اشتمالیت کسی بالشویک کو بھی نہ سُوجھی ہوگی۔ رسوم شادی اور بچوں کی پیدائش نیز اُن کی پرورش اور تربیت وغیرہ سب ریاست کی نگرانی میں انجام پاتی ہیں۔ ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور ایک وسیع مشترک خاندان۔ اس ریاست کے لئے افلاطون نہ صرف علم عقل اور ارادے کو ضروری سمجھتا ہے بلکہ جذبۂ محبت کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔ افلاطون کے ان خیالات کا ایتھنز اور سپارٹا کی یونانی ریاستوں پر اثر پڑا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اُسی کی تعلیم اور اُسی کے خیالی سے نظریوں کا اثر تھا کہ آگے چل کر سِسرو اور آگسٹائن اور پھر ٹامس مور اور لاک اور رُوسو وغیرہ نے آزادی کے خیالات کا اظہار کیا اور بعد میں اشتراکیت کے علم کی بنیاد پڑی۔

ہندوستان میں بُدھ مت کی تحریک ایک خاص زمانے کے ہندوؤں کی سُودخواری اور ذات پات کے نظام کے خلاف ایک مذہبی رَدِ عمل تھا۔

پھر ساتویں صدی عیسوی میں ایک دُور دراز بھولے بسرے صحرا میں "وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صَوتِ ہادی" آزادی اور مساوات اور اخوت کا پیغام دے کر "عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی"۔ بتوں اور دیوتاؤں سے، بادشاہوں اور حکمرانوں سے، عورتوں کو مردوں سے، انسانی دل کو توہمات سے آزادی کا سبق مِلا اور کالے گورے کی مساوات، شریف و رذیل کی مساوات، امیر و غریب کی اخوت، عرب و حبشی کی اخوت کی محض تعلیم نہیں، اِن کی عملی صورت سب سے پہلے پہل پیغمبرِ اسلام نے دُنیا کو آشنا کیا۔ لآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے معنی ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں ڈھونڈو تو یہی معلوم ہوں گے کہ دُنیا میں کسی شخص یا کسی چیز کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ برابری کا مظاہرہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خلیفہ عمرؓ اور اُن کا غلام سفر میں باری باری اُونٹ کی سواری کرتے تھے اور ہندوستان میں چھیاسی سال تک غلاموں کے ایک خاندان نے حکومت کی۔ گبن کہتا ہے کہ "کوئی شخص ایک ۔ حملے کے کہنے سے مفتوح ہو یا غلام، قیدی ہو یا مجرم یکایک فاتح اور آزاد مُسلم کے پہلو بہ پہلو آ کھڑا ہوتا اور اُنہیں حقوق کا مستحق ہوتا جو تمام مسلمانوں کو حاصل تھے"۔ اپنی آخری تقریر میں حضرت محمدؐ نے کہا کہ "عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تمہارے غلام تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی اُن کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی اُن کو پہناؤ"۔ خود اُنؐ کا غلام جتنا کام اُن کا کرتا تھا اُس سے

زیادہ کام وہ اُس کا کر دیتے تھے ۔ آج دُنیا میں غلامی کہنے کو ناپید ہے لیکن حق یہ ہے کہ اشتراکی سرمایہ داری کے نظام کو جو ایک غلامانہ نظام کہتے ہیں وہ بڑی حد تک درست ہے ۔ معاشرت نے ذات پات میں، دولت نے امیر غریب میں اور علم نے جاہل و عالم میں ایسی دیواریں حائل کر دی ہیں کہ انسانی زندگی ایک زنداں سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی ۔ مکّے میں حج اسلامی اشتراکیت کا سالانہ مظاہرہ تھا ۔ جائداد کے متعلق اسلامی قانون سراسر جمہوری اصُولوں پر مبنی تھا ۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (مفلسی میرے لئے باعثِ فخر ہے) کہہ کر آنحضرتؐ نے مفلسی اور مزدورانہ کام کی وقعت بڑھائی لیکن گو آج تک اس اپنی ذلّت و خواری کے زمانے میں بھی مسلمانوں میں آزادی مساوات اور اخوّت کی بعض خاص نشانیاں پائی جاتی ہیں تاہم سچی اسلامی اشتراکیت کا دَور صرف چالیس سال تک قائم رہا اور خلفائے راشدین کے بعد ۶۶۱ءؔ میں ختم ہو گیا ۔

اسلام کے بعد پروٹسٹنٹ اِزم نے پاپائیت اور شہنشاہیت کے خلاف عَلَم بلند کیا لیکن سیاسی انقلاب کی صُورت ۱۷۸۹ءؔ کے فرانسیسی انقلاب ہی میں واضح طور پر نظر آئی ۔ اس کے بعد ردِّ عمل ہوا لیکن ۱۸۳۰ءؔ اور بالخصوص ۱۸۴۸ءؔ کے انقلابات نے سرمایہ دار یورپ کو چین سے سونے نہ دیا ۔

اِس وقت کے حالات سمجھنے کے لئے یہاں گزرے ہوئے زمانے پر پھر ایک نظر دوڑانی چاہئے ۔ مزدوروں کا گروہ اپنی موجودہ صورت میں پہلے پہل دَورِ حاضر کے شروع میں پندرھویں صدی میں وجود میں آیا ۔ اٹھارھویں صدی میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو ایک بے دست و پا جماعت پایا جو صرف سرمایہ داروں کے رحم پر زندگی بسر کر سکتی ہے ۔ سائنس کی نئی ایجادات نے دستکاریوں کا خاتمہ کر دیا اور کاریگر مشینوں اور مشین والوں کے غلام بن گئے ۔ مزدور پہلے اس نئے صنعتی ظلم و ستم کے نیچے دبے اور پسے اور پھر ان مظالم کی وجہ سے اُبھرے اور اُٹھے اور منظم ہو گئے ۔ انگلستان میں چارٹسٹ تحریک نے بھی اُنہیں کچھ حق دلوائے ، کارخانوں کے کچھ خاص قوانین بھی بنائے گئے جن سے مزدوروں کی بہتری مقصود تھی ۔ اُنیسویں صدی میں اشتراکی خیالات خاص طور پر انگلستان جرمنی اور فرانس میں پھیلے کہ یہی ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے ۔ انگلستان میں ۱۸۹۳ءؔ میں "آزاد مزدور پارٹی" بنی اور ۱۹۰۰ءؔ میں "مزدور پارٹی" مرتب ہوئی لیکن اشتمالیت کبھی سرمایہ دار انگریزوں کے ہاں مقبول نہ ہو سکی ۔ پارلیمنٹ کی "مزدور پارٹی" بھی کبھی سیاسی علماء کی ایک جماعت سے زیادہ خوفناک نہ بن سکی اور آخر کار سرمایہ داری اور شہنشاہیت ہی کا ایک آلۂ کار بن گئی ۔ اِس وقت انگلستان میں چند اشتمالی مفکّرین کا ایک مختصر سا گروہ ہے جو کتابی پروپیگنڈا سے تھوڑا بہت اثر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ جرمنی میں پہلے پہل ۱۸۶۹ءؔ میں مزدور پارٹی بنائی گئی ۔ ۱۹۱۲ءؔ میں ریشتاغ میں ایک تہائی تعداد اشتراکیوں کی تھی لیکن ان میں بہت پھوٹ پڑ گئی اور عہدِ حاضر کے یورپ میں آزادی کی جدید تحریک کا سب سے تاریک باب یہ ہے کہ جرمن اشتراکیت پہلے شہنشاہیت اور پھر نازیت کے نیچے دب کر رہ گئی ۔ فرانس میں اشتراکیت کی ایک نئی شکل "سنڈیکلیت" نے سر اُٹھایا جو ٹریڈ یونین کے اِداروں اور ہڑتالوں اور بائیکاٹ کے صنعتی حربوں کو استعمال میں لاتی تھی اور انفرادی آزادی کی زبردست حامی تھی ۔ لیکن فرانس کے اشتراکی بھی جلد ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے جیسا کہ فرانسیسیوں کا عام قاعدہ ہے ۔ یوں آج کل فرانس میں ایک نیم اشتراکی حکومت برسرِ اقتدار ہے ۔

اُنیسویں صدی کا وسط زمانۂ حال کی اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کے صحیح آغاز کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے سولھویں صدی کے آغاز میں ٹامس مُور نے اپنی کتاب "یُوٹوپیا" میں اشتراکی ریاست کا ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا تھا۔ اس میں نہ صرف ذاتی ملکیت کا خاتمہ کرنا تجویز کیا گیا بلکہ بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جن پر آج کل رُوس میں عمل ہو رہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں سینٹ سائمن فُوریئے اور رابرٹ اوین نے سرمایہ داری کے خلاف اپنی آواز بلند کی بالخصوص اوین نے جس نے امریکہ میں چند اشتمالی نوآبادیاں بھی قائم کردیں لیکن سیاسی تبدیلیاں نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاشی تجربہ جلد ناکامی میں ختم ہوگیا۔

اس کے بعد مارکس اور اینگلز دو اشتمالی مصنفین نے مل کر اشتمالیت کا علم مرتب کیا اور اُس کے اُصول ایسے واضح طور پر بیان کردیئے کہ پھر ان میں شک وشبہ کی ذرا گنجائش باقی نہ رہی۔

بلاشبہ اشتراکیت کا سب سے بڑا پیغامبر اور زبردست رہنما کارل مارکس ہے (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء)۔ وہ ایک جرمن یہودی تھا تماشا دیکھو کہ دُنیا کی سب سے مالدار اور سب سے زیادہ سُود خوار قوم میں سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن پیدا ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں اُس نے اپنا مشہور "اشتمالی اعلان" شائع کیا جس سے یورپ بھر میں آگ لگ گئی اور جابجا بغاوتیں اور انقلاب برپا ہوگئے۔ ۱۸۶۷ء میں اُس نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" شائع کی۔ ۱۸۶۴ء میں اُس نے انگلستان میں مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہی بعد میں فرسٹ انٹرنیشنل یعنی پہلی بین الاقوامی کہلائی۔ یہ ۱۸۷۶ء تک زندہ رہی۔ مارکس نے ۱۸۷۰ء میں اپنی اشتراکی انجمن کی شاخیں یورپ کے مختلف شہروں میں کھول دیں لیکن ۱۸۷۲ء میں انارکزم یعنی نراج کے مشہور رہنما بکیونن (۱۸۱۴ء تا ۱۸۷۶ء) سے لڑائی اور اُس کے اخراج سے اشتراکیت کو خاصا ضعف پہنچا۔ دوسری انٹرنیشنل ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۱ء اور شاید ۱۹۱۴ء تک یعنی جنگِ عظیم تک سسکتی رہی۔ تیسری انٹرنیشنل وہ ہے جس کی بِنا لینن نے رُوسی انقلاب کے بعد ۱۹۱۹ء میں ڈالی۔

یہ ہے انقلابِ رُوس تک اشتراکیت کی مختصر تاریخ۔ انقلابِ رُوس کے بعد موجودہ اشتراکیت اپنی صحیح شکل میں دُنیا کے ایک بڑے ملک میں قائم ہوگئی۔

پیشتر اس کے کہ ہم رُوسی انقلاب اور رُوسی ریاست پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اشتراکیت اپنی عملی صُورت میں کیا کچھ کرچکی اور کیا کچھ کر رہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیوں کے نظریۂ اشتراکیت کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

مارکس کے تین بڑے نظریے ہیں۔ اوّل تاریخ کی مادّی تشریح کا نظریہ۔ مارکس کہتا ہے کہ انسانی معاشرت کے تمام مُظاہر اور واقعات کا منبع اُس کے مادّی حالات ہیں۔ سیاسی اِدارے، قوانین، مذہب، فلسفے یہ سب کے سب سوسائٹی کے مُعاشی نظام کے اظہار ہیں۔ ہماری سیرت اور ہمارے خیالات زیادہ تر مادّی و معاشی حالات ہی کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ یہی حالات دراصل اُن سینکڑوں چیزوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں جنہیں بظاہر مال و دولت یا معیشت سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ تاریخ کی ساری تحریک اُس کے نزدیک لازمی اور بڑی حد تک جبری ہے اور وہ مادّی اسباب کی اہمیّت پر اصرار کرتا ہے لیکن وہ اور اُس کے پیرو اِس جبر میں بھی انسانی اختیار کا جھنڈا بلند

رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب انسان باشعور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر آپ اپنی تاریخ کو بنا سکتا اور بدل سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ ایسے وقت میں بھی حالات کے مطابق عمل کرنے پر تیار نہ ہو گا تو تاریخ کا دیو اُسے کچل کر رکھ دیگا۔ سو اگر تم کو آنے والی ہلاکت سے بچنا ہے تو اشتمالیت کی تحریک میں شامل ہو جاؤ پھر تم اپنے اور دُنیا بھر کے محسن بن جاؤ گے۔

تاریخی مادیت کا یہ نظریہ ایک نئی قسم کی "توجیہی منطق" پر مبنی ہے جو عام رائج منجمد منطق کی بجائے ایک زندہ و حرکی منطق ہے اور جو اضداد سے پرہیز کرنے کی بجائے اضداد ہی کے ذریعے سے حقیقت کو سمجھتی ہے اس کے نزدیک حقیقت کوئی جامد شے نہیں بلکہ ہر دم زندہ و نابندہ ہے اور ہر گھڑی نئی نویلی ہے۔ اور ہر طاقت یا تحریک کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُس کے خلاف ایک اور طاقت یا تحریک رُونما ہو جائے اور پھر یہ دونوں طوعاً و کرہاً ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک نئی حقیقت کو وجود میں لے آئیں اور یہ حقیقت پھر تخالف و تطابق کے ایک نئے سلسلے کی کڑی بن جائے اور انسانی ترقی میں ممد و معاون ہو اور یوں یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔ اس نظریے کے ماتحت چونکہ تاریخ میں اسباب و علل کی حکمرانی ہے اس لئے ماضی و حال کے مطالعہ اور اُس پر غور کرنے سے مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں کی جا سکتی ہیں جیسی کہ مارکس نے کیں۔ مارکس کا دوسرا نظریہ سرمائے کے چند در چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہونے سے متعلق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری کے دور میں صنعتی ترقی کا یہ خاصا ہے کہ بتدریج صرف بڑے بڑے سرمایہ دار بڑے بڑے کاروبار چلا سکتے ہیں اُن کے اجارے قائم ہو جاتے ہیں۔ اس سے دولت تھوڑے لوگوں کے پاس اور اکثر لوگوں کے پاس روز بروز تھوڑی ہوتی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں تیسرا نظریہ جماعتوں کی جنگ کا ہے۔ سرمایہ دار ہی مزدوروں کے طبقے کو وجود میں لاتے ہیں اور پھر یہی اُس کی مصیبتوں کا سامان پیدا کرتے ہیں اور آخر کار یہی اسے تباہ کر کے رہیں گے۔ مزدور بتدریج بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ سرمایہ داروں کی کلوں کے غلام ہیں۔ یہ کلیں عموماً اپنے غلاموں سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اپنا کام کاج کھو بیٹھتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں جس پر سرمایہ دار یا سرمایہ دار حکومت اُنہیں اپنی خیرات کا نشانہ بنا کر اُن کی بے روزگاری کی روک تھام کرتی اور اُن کا شکریہ طلب کرتی ہے۔ اِن باتوں سے مزدور طبقے میں روز بروز زیادہ بیداری پیدا ہو کر شعور اور خودداری کے جذبات اُبھرتے ہیں اور وہ ہڑتالوں اور آخر کار انقلاب پر اُتر آتے ہیں۔

یہ تمام خیالات مارکس کے مشہور **اشتمالی اعلان** میں موجود ہیں جو مزدوروں کے اِس مفکر کے انتہائی زور و قوت اور شدتِ احساس کا ایک مظاہرہ ہے وہ کہتا ہے کہ ایک بھوت یورپ کی تاک میں ہے اشتمالیت کا بھوت۔ یورپ کی ساری طاقتیں متحد ہو گئی ہیں کہ اُس کا قلع قمع کر دیں لیکن جماعتوں کی یہ جنگ کوئی نئی بات نہیں ساری انسانی تاریخ فی الحقیقت جماعتوں ہی کی جنگ سے بھری پڑی ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے عوام میں سے شہروں کے تاجر بنے اور شہروں کے تاجروں سے زمانۂ حال کے سرمایہ دار۔ نو آبادیاں دریافت ہوئیں اور اُن میں نئی منڈیاں۔ جاگیری نظام اُنہیں سنبھالنے کے لئے ناکافی تھا سو ناکام رہا۔ نوابوں کی جگہ نئے تاجروں نے لی، اُس سے تجارت پھیلی، سرمایہ بڑھا، تاجروں کا سیاسی اقتدار بھی زیادہ ہوا، آزاد شہروں کی بنیاد پڑی، دارالعوام اور دوسرے نیم جمہوری ادارے ظہور میں آئے لیکن اِن کے ساتھ ہی دستی صنعت کی جگہ نئی صنعت نے لے لی۔ مزدوروں کے نوابوں سے وہ پُرانے ذاتی تعلقات ٹوٹ گئے وہ تن تنہا رہ گئے، نفع اور زرطلبی نے پیشوں کو ذلیل کر دیا جس سے اندر ہی اندر ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ دیہات شہروں کے غلام ہو گئے۔ منڈیوں کی وسعت سے قوموں کا نئی قوموں سے واسطہ پڑا۔ تنگ خیالی دُور ہونے لگی۔ آزاد مقابلہ نے تجارت کو فروغ دیا لیکن ساتھ ہی تجارتی

بحران بھی آئے۔ مزدوروں کا مشینوں سے تصادم ہوا۔ اس سارے عمل اور ردِ عمل سے ایک نئی انقلابی زندگی کا آغاز ہوا گویا سرمایہ داروں نے آپ اپنی ہلاکت کا سامان تیار کر دیا۔ پہلے بورژوا یعنی متوسط طبقے نے اپنے مخصوص ہتھیاروں سے جاگیری نظام کا خاتمہ کیا تھا اب انہیں ہتھیاروں سے مزدوروں کے ہاتھوں بورژوا کا خاتمہ ہونے کو ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اب صرف دو جماعتیں رہ گئی ہیں بورژوا یعنی متوسط طبقہ اور پرولیتاریہ یعنی مزدور طبقہ۔ مزدور روز بروز زیادہ نادار ہوتے ہیں اور مشینوں کے نیچے پستے ہیں۔ سو پہلے وہ الگ الگ پھر باہم مل جل کر اپنے کارخانہ داروں کے خلاف ہر طریقے سے جنگ کرتے ہیں۔

غرض اس طرح مہذب سوسائٹی میں یہ تین معاشی نظام جاگیرداری، سرمایہ داری، اشتراکیت یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ ہر ایک اپنے وقت اور مخصوص حالات کے لئے موزوں تھا ہر ایک نے اپنا کام کیا اور مفید ثابت ہوا۔ جب معاشرت میں ابھی امن و امان نہ تھا تو جاگیرداری نظام نے امن و امان قائم کیا، اور تہذیب کو مدد دی۔ جب قومیت مضبوط ہوئی، نو آبادیات کے دروازے کھلے، تجارت پھیلی، سائنس کی ترقی کے ساتھ ایک نئے صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا تو سرمایہ داری نے آکر ان حالات سے فائدہ اٹھایا، اپنے آپ کو بڑھایا اور ساتھ ہی تہذیب و تمدن میں ربط و ضبط پیدا کیا۔ لیکن ہر تحریک ایک مخصوص وقت کے لئے ہوتی ہے اور ایک مخصوص مقصد کو پورا کرتی ہے، جب یہ زمانہ گزر جاتا ہے اور یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ایک نئی تحریک اور ایک نئے نظام کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ تبدیلی کبھی آسانی سے اور کبھی ہزار دقتوں سے ہوتی ہے لیکن ہوتی ضرور ہے اور ہو کے رہتی ہے۔ یہی حالت موجودہ سرمایہ داری کی ہے، زمانے کے حالات بدل گئے ہیں اور اُن کا تقاضا ہے کہ اب اشتراکیت کا نظام رائج ہو۔

مارکس کہتا ہے کہ اس سے پہلے کی ساری تاریخی تحریکات اقلیتوں کی تحریکات تھیں۔ اشتمالیت یا مزدوروں کی تحریک پہلی تحریک ہے جو اکثریت کی تحریک ہے۔ "اشتمالی بین الاقوامی ہیں اُن کا کوئی ملک نہیں کوئی وطن نہیں۔ اشتمالیوں کا فوری مقصد سیاسی قوت کا حصول ہے۔ اُن کا نظریہ مختصر ہے یعنی ذاتی جائداد کی موقوفی۔ فی الحال اشتمالیوں کا پروگرام ریاست کی قوت کو بڑھانا ہوگا لیکن بعد میں ریاست کا بطور ریاست کے خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ اعلان کے اخیر میں اشتمالیت کی طرف سے دُنیا بھر کے مزدوروں کے نام اپیل ہے کہ اشتمالی اپنے مقاصد کو چھپانا لغو سمجھتے ہیں بہتر ہے کہ حکمران اُن کی بات خوب سمجھ لیں اور آنے والے اشتمالی انقلاب پر کانپ اُٹھیں۔ غریبوں کے پاس سوائے اُن کی زنجیروں کے اَور کچھ نہیں جسے وہ کھو سکیں، اُنہیں ایک دُنیا فتح کرنی ہے۔ اے سب ملکوں کے مزدورو! متحد ہو جاؤ!"

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے اِس اعلان کا چھپنا تھا کہ یورپ کے اکثر ملکوں میں انقلاب کی آگ بھڑک اُٹھی لیکن ابھی یہ شعلہ نمائی قبل از وقت تھی۔ تاہم بہت سے ملکوں میں اشتراکی تحریک بتدریج زور پکڑنے لگی یہاں تک کہ جنگِ عظیم کے بعد اُس نے رُوسی انقلاب کی مستقل شکل اختیار کر لی۔

اپنی کتاب "سرمایہ" میں مارکس نے مزدوروں کی بیکسی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں جن سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک عورت میری این و اکلے نے مسلسل ۲۶½ گھنٹے کام کیا۔ اُس نے یہ کام تیس اَور لڑکیوں کے ساتھ مل کر ایک ایسے کمرے میں کیا جہاں ہر متنفس کے لئے ۱/۳ مکعب فٹ ہوا مہیا تھی۔ ایسے ہی کئی اَور واقعات ہیں۔

مارکس نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں اُن میں سے کئی اُس کے بعد پوری ہو گئیں۔ مثلاً اُسی طرح مال و دولت تھوڑے انسانوں کے ہاتھوں میں جمع ہوتی گئی۔ اجارے بڑھتے گئے، مزدوروں میں بےچینی پیدا ہوئی، وہ مجتمع اور متحد ہوئے۔ سرمایہ داری میں رخنے پڑتے گئے۔ سرمایہ داری نے شہنشاہیت کی صورت اختیار کی اور اپنے لئے نئی نئی منڈیاں تلاش کیں جس سے عالمگیر جنگ کا ظہور ہوا اور اس سے بعد میں اشتراکیت نے طاقت پکڑی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن قومیت بجائے

کمزور ہونے کے زیادہ پُر زور ہوئی اور بین الاقوامی مالیات اُسے دبا نہ سکی۔ بڑے کاروبار کے ساتھ ہی ساتھ چھوٹے حصہ داروں اور چھوٹی کمپنیوں کی تعداد بھی توقع سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور اس طرح پہلے کی نسبت بہت زیادہ لوگ سرمایہ داری کے نظام سے وابستہ اور اس لئے اُس کے محافظ بن گئے۔ بلکہ تماشا یہ ہے کہ ماہر مزدور مزدوروں میں ایرکیسی بن بیٹھا اور سوچنے لگا کہ کیا مجھے سرمایہ دار کے ساتھ ملنا چاہیئے یا عام مزدور کے ساتھ؛

پس سرمایہ داری کا موجودہ نظام جو اس وقت دنیا کے بیشتر حصے میں قائم ہے گو اُلجھن میں پڑا ہے مگر ابھی تک بدستور قائم ہے اور اپنے ساتھ ساری انسانی معاشرت کو اُلجھنوں میں ڈالے ہوئے ہے۔ موجودہ نظام کے طرف دار کہتے ہیں اور ایک حد تک ٹھیک کہتے ہیں کہ اس میں انفرادی ہمت اور انفرادی کاروباری قابلیت کو اپنی ترقی کے لئے ایک وسیع میدان ملتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بات صرف ایک حد تک اور صرف بعض افراد کے لئے درست ہے، نوع انسان کی اکثریت کے لئے درست نہیں ترقی کے موقعے میسر ہیں تو عموماً صرف امیروں یا کہیئے کہ بعض خوش قسمت لوگوں کو میسر ہیں، باقی ماندہ اکثر لوگ یا ان سے قطعاً محروم رہتے ہیں یا صرف تھوڑا بہت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

دولت کی موجودہ تقسیم پرلے درجے کی بے انصافی پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام کے ماتحت اشیاء نفع اُٹھانے کے لئے بنائی جاتی ہیں نہ کہ استعمال کے لئے۔ بعض اشیاء ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتی ہیں مثلاً خوراک مکانات وغیرہ بعض مفید کاموں میں صرف ہوتی ہیں مثلاً تعلیم سڑکیں باغات وغیرہ اور بعض بیہودہ کاموں میں مثلاً جوا بازی، بدکاری وغیرہ۔ بعض سے سرمایہ کا نیا اثاثہ تیار ہوتا ہے مثلاً کارخانے جہاز گاہیں وغیرہ۔ نام نہاد مکمل آزادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں بہت سی اشیاء محض فضول اور ضرورت سے زیادہ تعداد میں تیار کر لی جاتی ہیں فقط اس لئے کہ اس سے زیادہ نفع کی توقع کی جاتی ہے۔ ہر شخص یا کمپنی کے جو جی میں آئے کر گزرتی ہے۔ مُدعا اُن کا یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ فائدہ کس شے میں ہے نہ یہ کہ نوع انسان کو کس شے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے فرانسیسی شرابوں اور اعلٰے سامان آرائش اور ہزاروں اور عیش و عشرت کی چیزوں پر کروڑوں اربوں روپیہ خرچ ہوتا ہے امیروں کے لئے بے شمار لذیذ فراہم کی جاتی ہیں جن سے اُن کی صحت خراب ہو جاتی ہے، اطمینان جاتا رہتا ہے اُن کے گھروں میں ڈاکٹروں اور شیروں کا تانتا لگا رہتا ہے اور ادھر لاکھوں کروڑوں انسانوں کو دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی۔ کئی اشیاء اتنی تعداد میں فراہم ہو جاتی ہیں کہ نفع کی غرض سے اُن کو تلف کرنا پڑتا ہے اور کئی اشیاء اتنی کمیاب یا اتنی مہنگی ہوتی ہیں کہ اس کمی کا لوگوں کی صحت پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے نظام میں سوائے طلب و رسد کی ڈھیلی بے جان ترازو کے اشیا کی فراہمی کے لئے کسی اور باشعور ہستی کو دخل دینے کا تو اختیار رہے ہی نہیں، جو کچھ ہوتا ہے وہ اس مفروضہ قدرتی قانون کے تحت میں ہوتا رہتا ہے اور اشرف المخلوقات انسان بے بس ہے۔ بیرونی ممالک کو قرضہ دے کر اشیاء کا خریدار بنایا جاتا ہے اور اِدھر اپنے ملک میں کئی لوگوں کو روٹی کپڑا خریدنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ سائنس کی ایجادات کی برکت سے معیارِ زندگی بدرجہا بڑھ سکتا ہے لیکن جہاں نظر محض نفع پر ہو وہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں روپیہ پیسہ انسانی کوششوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ بار آور ثابت ہوتا ہے۔ پھر نفع کی تلاش میں سرمایہ داروں کے مقابلے کی وجہ سے قوموں میں سرمایہ دار شاہنشاہیت کی رقابتیں شروع ہو جاتی ہیں جس سے ہر وقت جنگ کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ جب تک یہ حالات ہیں صلح کے لئے بین الاقوامی کانفرنسیں کرتے پھرنا محض لاحاصل ہے۔ موجودہ حقوق اور ذاتی ملکیت کی حفاظت و پرورش نے دُنیا کو یہ دن دکھائے ہیں کہ روز و شب تہذیب کے سر پر جنگ و جدل کی تلوار لٹکی رہتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے ابھی گری کہ گری۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات بہتر نہیں ہو سکتے جب تک کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں نہ لائی جائے اور وہ یہی ہے کہ موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام کی جگہ

ایک اشتراکی نظام رائج کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرمایہ داری جد وجہد کے وقت میں نوع انسان کے کام ضرور آئی لیکن اب فراوانی کا زمانہ ہے اب محض نفع کے چابک سے انسانیت کے ٹٹو کو ہانکنا ٹھیک نہیں۔ اشیاء کی پیدائش کے عمل کو بڑھانے سے کیا حاصل اگر اشیاء کی تقسیم مناسب طور پر نہیں ہو سکتی۔

سرمایہ داری نے معاشی گڑبڑ کو دیکھ کر کئی ایک ترکیبیں نکالیں عجیب و غریب چالیں چلیں کہ کسی طرح اُس کی چلتی گاڑی میں جو روڑے اٹک رہے ہیں وہ رستے سے دُور ہو جائیں لیکن سوائے عارضی صفائی کے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ مختلف جماعتوں نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے اتحادِ مزدوراں کی انجمنیں، صارفین کی انجمنیں، اجارے، جتھے کیا کیا نہ بنایا اور یہ بھی نہ ہوتا تو سرمایہ داری کے خلاف کبھی سے بغاوت ہو چکی ہوتی اور اسی لئے گو بد دماغ آمرین اپنے ملکوں میں ان کی موقوفی پر تُلے ہوئے ہیں جمہوری ملکوں میں اِن کا قلع قمع کرنا اب ممکن نہیں رہا۔ اِن کے علاوہ حکومتوں نے خود متعدد حربے استعمال کئے مثلاً محاصل چُنگی مبادلے کی بندشیں، مالی امدادیں یہاں تک کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قیمتیں مقرر کئے جانے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن سب لاحاصل۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ سرمایہ داری کے ہوتے ہوئے منصوبہ بندی بے معنی ہے جب ہی تو "فراوانی میں مفلسی" کا بھیانک منظر ساری دُنیا کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے کہ اِدھر اشیاء کی اتنی بہتات اور اُدھر سرمایہ داروں کو دیوالیہ ہونے کا خطرہ اور غریبوں کو فاقہ مستی کا ڈر! بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست! بازار اس طرح چڑھتا اُترتا ہے گویا وہ ایک بھُوتوں پریتوں کا برپا کیا ہوا فتنہ ہے جس کی اونچ نیچ بیچارے انسانوں کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتی۔ محض اصلاحات سے سرمایہ داری کے بیمار کی شفا ممکن نہیں کیونکہ سرمایہ داری کا تو خیال ہی یہ ہے کہ چیزوں کو اپنے فطری حال پر چھوڑ دینا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے پس اِس خیال کے ساتھ اِس بڈھے بیمار کی دوا کرنا لاحاصل ہے بہتر ہے کہ اس مرنے والے کے سرہانے فاتحہ پڑھنے کی تیاری کی جائے۔

سرمایہ داری کے نظام کی **سختیاں اور محرومیاں** دو ایک مثالوں میں دیکھو۔ انگلستان اور امریکہ میں غریبوں امیروں کے **فرق** کا تناسب ۴۰،۰۰۰ اور ۱ ہے اِس کے مقابلے میں موجودہ رُوس میں یہ صرف ۱۵ اور ۱ ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ امریکہ کی ۱۹۳۲-۳۴ء کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہے کہ ۱۶ سے ۲۵ برس تک کے دو کروڑ پندرہ لاکھ (۲،۱۵،۰۰،۰۰۰) نوجوانوں میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ (۱،۶۵،۰۰،۰۰۰) نوجوان سکولوں سے نکل کر بیروزگار پھر رہے ہیں۔ ہماری دُنیا میں اگر ایک نہایت مہذب، روشن خیال، ترقی یافتہ قوم کا یہ حال ہے تو پھر تہذیب اور روشن خیالی اور ترقی کا خدا ہی حافظ ہے!

یہ تو ہے سرمایہ داری کی حالت اور اُس کے خراب نتیجے۔ **اشتراکیت کی عملی تجاویز** میں سب سے بڑی اور موٹی بات یہ ہے کہ پہلے موجودہ معاشی نظام کی بنیاد کو اُکھاڑ کر رکھ دو یعنی اشیاء کے نفع کا خیال چھوڑو اور ضرورت و استعمال کے اصول پر چلو۔ زمین اور سرمایہ کی ذاتی ملکیت کو موقوف کر دو۔ سب اشیاء ملک کی جائداد ہوں اور ساری پیداوار کو لوگوں کے کام کے مطابق اُن میں تقسیم کیا جائے۔ بعض اشتراکیوں کا خیال ہے کہ موجودہ مالکوں کو کچھ معاوضہ یکمشت یا سالانہ دیا جائے لیکن اکثر اِس کے مخالف ہیں۔ اشتمالیوں کا خیال ہے کہ جس طرح ہر شہری اب سڑکوں سکولوں باغات وغیرہ سے بلا معاوضہ فیضیاب ہوتا ہے اسی طرح متمدن زندگی کے تمام یا اکثر اداروں یا آسائشوں کے دروازے بالکل کھول دینے چاہئیں اور ہر شہری کو اُن سے فائدہ اور لطف اُٹھانے کا پورا حق دے دینا چاہیئے۔ ریلیں مفت کی ہوں، موٹریں مفت کی ہوں، تھئیٹر اور سینما مفت کے ہوں، مکانات مفت کے ہوں، کھانا پینا سیر کرنا علاج کرنا تعلیم پانا اخبار اور کتابیں پڑھنا سب مفت میں ہو سکے۔ کہاں ہم لوگ کہ "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے" کہہ کر جو کچھ ہاتھ آئے اُسے لینے کو تیار رہیں اور کہاں آنے والے دَور کے اشتمالی جنہیں دُنیا کی بُری نہیں ہر اچھی چیز مفت ہاتھ آجائے گی۔ یہ اگر

کبھی ممکن العمل ہے تو کون ہے جو دل سے یہ نہ چاہے گا کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ زمانہ آ جائے !

لیکن اشتراکی خوب سمجھتے ہیں کہ محض ان کے کہنے اور ہمارے سننے اور سر دھننے سے نہ سرمایہ داری کا خاتمہ ہو گا اور نہ اشتراکیت کا آغاز۔ زرمی طلبی سخن درین است والا معاملہ ہے۔ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے بڑی بھیانک اور بڑی شاندار مثال ہے کتنے لاکھ قتل ہوئے اور اب بھی شاید کتنے لاکھ محبوس ہیں مجبور ہیں مظلوم ہیں لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کروڑوں مطمئن ہیں اور پہلے سے زیادہ خوش حال بھی ہیں اور خوش دل بھی۔ اور یہ اشتراکی بڑے گرمجوش اور تند اور اپنے خیال اور اپنے اعتقاد کے پکے آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ مذہب ہے کہ فرد جماعت ہے، انسان نوعِ انسان ہے، ہماری حقیقت معاشری ہے، ہم میں سے ہر ایک معاشری کل میں حل ہونے کے لئے ہے، زمانہ ہم میں سے ہر ایک کو بلا رہا ہے کہ نوعِ انسان کے لئے ایک نیا دور آ گیا ظلمتوں کے کونے کونے میں روشنی پھیل گئی اور تم ابھی سو رہے ہو اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو کھو رہے ہو۔ اٹھو اور اٹھ کر اشتراکیت کی نئی زندگی میں حصہ لو ورنہ یہ طوفان سب ظالموں اور غافلوں اور نکموں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جائیگا اور ڈبو کے رہے گا۔

اشتراکیت کے بعض فائدے ظاہر ہیں، اس میں نفع کی غرض جاتی رہتی ہے۔ ہر شخص کو آرام اور فرصت اور اطمینان کا کچھ وقت ملتا ہے اور یہ تسلی ہوتی ہے کہ میں اور میرے بچے فاقے نہ مر جائیں گے۔ کوئی شخص بغیر خود کام اور محنت کیے دولت نہیں کما سکتا۔ موروثی امیروں کی نکمی جماعت کا خاتمہ ہو جاتا ہے تعلیم صحیح قسم کی دی جاتی ہے جس کا مقصد محض روپیہ بٹورنا نہیں ہوتا، عورتوں کو آزادی ملتی ہے اور بچوں کی مناسب نگہداشت ہوتی ہے فنون و علوم کا صحیح استعمال اور ان کی صحیح قدر ہوتی ہے۔ امورِ عامہ کے محکمے زیادہ اچھی طرح چلائے جا سکتے ہیں اور اشتراکیت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کا خاتمہ ہو کر جنگ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور دنیا میں امن و امان بآسانی قائم رہ سکتا ہے۔

اشتراکی مقابلے کی جگہ تعاون، قومیت کی جگہ بین الاقوامیت اور قسمت کی جگہ علم و ہمت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ ایک حقیقی لیگ اقوام قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ سب آزادیوں اور ترقیوں کی بنیاد معاشی آزادی کو سمجھتے ہیں اور ان میں سے اکثر کو یقین ہے کہ یہ بغیر تشدد اور انقلاب کے قائم نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ داری ایک بلکہ کئی خونریز لڑائیوں کے لڑے بغیر کبھی ہتھیار نہ ڈالے گی۔ وہ ابھی دنیا کے اکثر حصوں پر حکمران ہے، دنیا کے اکثر باشندوں کے پاؤں میں اس کی بیڑیاں ہیں، اس کی بنیادیں بغیر اکھاڑے جلد اکھڑنے والی نہیں۔ اسی لئے سب اشتراکی ایک زبردست جد و جہد بلکہ ایک عالمگیر جنگ کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ **اشتراکیت عمل میں** کیونکر آتی ہے اور برسرِ اقتدار ہو کر نوع انسان کے لئے کیا کچھ کرتی ہے چند لمحوں کے لئے روس پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔

جنگِ عظیم سے پہلے روس ایک قیانوسی ملک تھا جہاں مطلق العنانی راج کرتی تھی بلکہ اسی لئے وہاں انقلاب آیا اور بڑے زور سے آیا۔ جنگ کے دوران میں ۱۹۱۷ء میں وہاں یہ بالشویک انقلاب برپا ہوا۔ اتحادیوں نے امن پسندوں کی مدد کی انقلابی اور بھڑکے چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جنگی اشتمالیت نے اپنے ستر ہزار بھائیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ ۱۹۲۱ء میں لاکھوں کسان فاقوں مر گئے جس پر لینن نے اپنی "نئی معاشی پالیسی" سے ان کی دلجوئی کرنی چاہی ۱۹۲۳ء میں سوویٹ کا دستور نافذ ہوا جس میں سات جمہوری حکومتیں شامل تھیں۔ ہر قوم کو اپنی تہذیب برقرار رکھنے کا اختیار دیا گیا بلکہ اس کی ترغیب دی گئی۔

لیکن باوجود ان مُظاہروں کے خفیہ پولیس کی سختیوں اور اشتمالی پارٹی کی آمریت نے حقیقی آزادی کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ حالات مشکل تھے سو اشتراکی اپنی مملکت کو خطرے میں نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں لینن مر گیا اور سٹیلن نے آکر ریاستی سرمایہ داری کی پالیسی اختیار کی۔ ۱۹۲۵ء میں "گوزپلین" کی منصوبہ بندی کے بعد ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ یہ منصوبہ بندی اس طرح کی جاتی ہے کہ پہلے اشیاء بنانے والے کارخانوں اور اداروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تم آئندہ سال میں کتنا مال تیار کرنا چاہتے ہو اور اس کے لئے تم کو کس کس چیز کی کتنی ضرورت ہے اور یوں مختلف اداروں میں تطابق پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر گوزپلین ان تجاویز کا حکومت کی مجوزہ سکیم سے تقابلہ کرتی ہے اور ایک سکیم بنا کر اُسے مختلف محکموں میں بھیج دیتی ہے۔ یہ محکمے اُسے پھر اشیاء تیار کرنے والے اداروں کے پاس بھیجتے ہیں۔ یہاں اس پر نکتہ چینی ہوتی ہے سب مزدور اور کارکن اپنی اپنی رائے دیتے ہیں اور اس تفصیلی تنقید کے بعد یہ سکیم ایک دفعہ پھر گوزپلین کے سامنے پیش ہوتی ہے جو مختلف تجاویز پر غور کر کے اُسے آخری بار اپنے سانچے میں ڈھالتی ہے اور حکومت کے پاس بھیج دیتی ہے اور حکومت اسے منظور کر کے ایک قانون کی طرح نافذ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے کام کرنے والوں کو آئندہ چند سالوں میں اتنا مال تیار کرنا اور یہ کام کرنے ہیں۔ پہلا منصوبہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک زیر عمل رہا۔ لوگوں کو کام کا جنون سا ہو گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ رُوس خطرے میں ہے اور ہمیں اُسے جلد سے جلد ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملک بنانا ہے۔ تعلیم و تربیت میں صنعت و حرفت میں فوجی و ہوائی قوت میں غرض زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اشتراکی اپنی کامرانی میں پاگل سے ہو گئے اور زمینداروں کی رہی سہی سرمایہ داری کو توڑنے اور اُنہیں اشتراکی قطعاتِ ارضی میں زبردستی شریک کرنے میں انہوں نے بڑے بڑے ظلم کئے جن پر خود اُن کے رہنما سٹالن نے اُنہیں علانیہ سرزنش کی۔ ۱۹۳۲ء تک رُوس نے اشتراکیت کا جامہ پہن لیا اور ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کی مثلاً ۱۹۱۴ء میں ۶۳ فی صدی آدمی ناخواندہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں یہ صرف ۹ فی صدی رہ گئے۔ دوسرا پنج سالہ منصوبہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک عمل میں آیا۔

۱۹۳۷ء میں ایک دلچسپ کتاب "ہمارے سامنے کیا ہونے والا ہے؟" چھپی ہے جس میں سوویٹ اشتمالیت کے مستقبل پر مسٹر سڈنی ویب نے جن کی شہرۂ آفاق کتاب "سوویٹ تمدن" پہلے شائع ہو چکی ہے خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دُنیا ۱۹۱۸ء سے لے کر کئی سال تک رُوس کو کنکھیوں سے دیکھتی رہی، نکتہ چینیاں کرتی رہی لیکن ۱۹۳۴ء میں جب اندھوں کو بھی یہ نظر آنے لگا کہ رُوس میں ہر شے کی بہتات ہے اور دسمبر ۱۹۳۶ء میں جب اہلِ سوویٹ نے ایک نئے جمہوری دستور کے نفاذ کا جو واقعی ہر معنی میں جمہوری تھا دُنیا کے سامنے اعلان کر دیا تو پھر دُنیا نے سمجھا کہ ہاں واقعی رُوس نے پچھلے بیس سالوں میں گویا صدیوں کا کام سرانجام کیا ہے۔

رُوس نے نفع بازی کا قلع قمع کر دیا ہے اور اراضی اور سرمایہ بالعموم سب مشترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن سرکاری اداروں کے سوا اور بھی بہت سے ادارے ہیں جن میں لوگوں کی شخصی آزادی بروئے کار آتی ہے مثلاً مزدوروں کی انجمنیں، صارفین کی امدادِ باہمی کی انجمنیں تعلیمی ادارے تھیئٹر وغیرہ۔ اسی طرح نصف سے زیادہ بالغ شہری سرکاری ملازم نہیں ہیں لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ رُوس میں کوئی شخص کسی اور سے بطور مزدور کے کام لے کر اُس کی کمائی سے نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ لوگوں کی تعلیم اور لوگوں کی صحت میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ محض بچوں کے لئے ایک سو تھیئٹر مخصوص ہیں۔ نئے دستور کے مطابق ۹ کروڑ سے زیادہ رائے دہندگان ہیں جن میں ۶ کروڑ دیہاتی ہیں اور ۳ کروڑ شہروں کے رہنے والے، نئے دستور میں ہر شخص کو ہر طرح کی مناسب آزادی حاصل ہے۔ اِس میں انسان کے بارہ بنیادی حقوق گنوائے گئے ہیں مثلاً منتخب کرنے کا

حق، نکتہ چینی کا حق، تقریر کا حق، جلسوں جلوسوں کا حق، فرصت کا حق، اپنی محنت کی پیداوار کا حق، صحت کا حق، ماؤں کے لئے زچگی میں آرام آسائش کا حق اور ایسے ہی اور ضروری حقوق۔ اس نئے دستور کے نفاذ سے حکومت ہر دلعزیز اور مضبوط ہو گئی ہے۔ جا بجا دیہات میں بھی اس دستور کے گیت گائے جاتے ہیں:۔

کھیت میں باجرا بویا ہے
اور اُس کی بالیں بڑھ رہی ہیں!
تعلیم حاصل کرنے کا حق میرا ہے
اب اُسے مجھ سے کون چھین سکتا ہے؟

ویب نے سوویٹ والوں کی تین خصوصیتیں گنوائی ہیں، اوّل تنوع ـــــ بیسیوں قومیں اپنی اپنی زبانیں اور عادات و اطوار اور مذاہب و کلچر رکھتی ہیں گویا کسے را با کسے کارے نہ باشد۔ پھر اسی ہزار چھوٹے سوویٹ ہیں جو رُوس کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک گویا ایک ننھی سی جمہوری حکومت ہے۔ دوسرے ہمہ گیری یعنی سب ترقیاں آناً فاناً کم ترقی یافتہ قوموں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ تیسرے شرکت رُوس کے رائے دہندگان دُنیا بھر میں سب سے زیادہ ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں آئے دن جتنے جلسے وہاں ہوتے رہتے ہیں اتنے دُنیا کے کسی اور دیہاتی خطے میں نہیں ہوتے۔ رُوس نے عورت کو صحیح معنوں میں آزاد کر دیا ہے۔ وہ کسی طرح اپنے شوہر سے کم رُتبہ نہیں رکھتی۔ وہ خود کام کر کے کماتی ہے جب عورت کام پر جاتی ہے تو وہ اپنے بچے کو ایک سرکاری پرورش گاہ میں چھوڑ جاتی ہے۔ حمل کے زمانے میں اُسے نصف تنخواہ پر چار ماہ کی چھٹی ملتی ہے۔ معاشری بیمہ کے فنڈ سے تین لاکھ عورتیں ایک سال میں تبدیلی آب ہوا کے لئے گئیں۔ ڈاکٹری کے پیشے میں اُن کی تعداد چالیس فی صدی ہے۔ مشین گن چلانے میں پانچ لاکھ عورتوں نے تعلیم پائی ہے اور بیس ہزار ہوا سے بم برسا سکتی ہیں۔ باکو میں عورتوں کا بہترین کلب ہے جس میں دس ہزار مسلمان عورتیں ممبر ہیں۔

بعض مصنفین نے اشتراکی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، نئی معاشری آزادی کی وجہ سے پہلے رُوسی خانگی زندگی میں ایک ہلچل سی مچ گئی لیکن حکومت خاندانی زندگی کے برقرار رکھنے میں اپنا پورا زور صرف کر رہی ہے اور خود لینن نے آوارہ نوجوانوں کی برائیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے آوارگی کو اشتراکیت کے لئے ایک خطرہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ انفرادی آزادی کی کمی، پروپیگنڈا کا زور، مذہب کی تضحیک اور مخالفت، امیرانہ خوشحالی کا فقدان، بے رنگ یکسانیت یہ رُوس کے دامن پر داغ ہیں۔ اشتراکیت کے حامی جواب میں کہتے ہیں کہ جمہوریت پہلے صرف اقلیت کے لئے تھی اب اکثریت کے لئے ہے۔ ایک اشتراکی مملکت کم از کم اس اکثریت کا مفاد تو پیش نظر رکھتی ہے۔ انفرادیت پسند سرمایہ دار ہمیشہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کی کمائی در اصل صرف اُن کی اپنی کمائی نہیں۔ سوسائٹی کے ہزاروں ارکان اس کمائی میں مدد دیتے ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ رُوس میں آزادی نہیں وہاں کے اخبارات میں صرف سوویٹ کا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ جرمنی اطالیہ کو چھوڑ دیجئے کہ وہاں تو آزادی رائے کا نام ونشان ہی نہیں لیکن انگلستان وغیرہ کو ہی لیجئے کہ وہاں کا پریس بھی دولتمندوں کے ہاتھ میں ہے آخر غریبوں کی اُس میں کتنی شنوائی ہے؟ پھر مزدوروں کی بے روزگاری ہر وقت کی تشویش اور کام کی شدت یہ کونسی آزادی کے مظاہر ہیں؟ آزادی بغیر معاشی آزادی کے ناممکن ہے

اور محض ایک فریب ہے۔ روس میں ابھی ضرورت سے زیادہ یکسانیت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانے خس و خاشاک کو صاف کیا گیا ہے اور بہت کاٹ چھانٹ ہوئی ہے اور نیا چمن بنتے بنتے بنے گا۔

مذہب کے متعلق اب اکثر اشتراکیوں کا خیال ہے کہ اُس کی مخالفت کی نہ ضرورت ہے نہ یہ مناسب ہے بلکہ مذہب نئے حالات میں خود بخود کمزور ہو جائے گا۔ اِس معاملے میں اشتراکی بھول جاتے ہیں کہ صحیح مذہب اپنے آپ کو حالات کے مطابق بدل سکتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت کی مذہبی حِس نئی دُنیا کے لئے رُوحانیت کی نئی شکلیں پیدا نہ کر دے!

اِس ضمن میں اشتراکیت کے ایک حامی نے حال میں جو تعلق اشتراکیت اور تجزیۂ نفس میں بیان کیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور اشتراکیوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ مارکسی اشتراکی داخلی یا نفسیاتی عناصر کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ مارکسیت بیرونی دُنیا پر روشنی ڈالتی ہے تجزیۂ نفس اندرونی یا نفسی دُنیا پر۔ اس لئے انسان کو مکمل طور پر جاننے کے لئے اِن دونوں کی ضرورت ہے۔ اور ضرورت ہے کہ یہ دونوں مِل کر انسانی دُنیا کو بہتر بنائیں۔ مارکسیت کا تاریخی مادیت کا اضدادی نظریہ تجزیۂ نفس میں بھی نظر آتا ہے۔ انسانی نفس میں متضاد چیزوں کا تصادم ہو کر قوت پیدا ہوتی ہے انفس مخالف طاقتوں کے اتحاد کی جلوہ گاہ ہے۔ انا حقائق زندگی کی درشتی کے متعلق مبالغہ کرتا ہے لیکن ایک اشتمالی سوسائٹی میں یہ درشتی خود بخود نرم ہو جائیگی۔ جو اشتمالی رہنما اپنی مارکسیت میں تجزیۂ نفس سے کام لے گا وہ دیکھے گا کہ انسانی فطرت کو سمجھ کر وہ لوگوں کی زیادہ اچھی طرح رہنمائی کر سکے گا۔

غرض اشتراکیت میں یہ اور اَور کمیاں ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ صدیوں کے نظام کو اُلٹ کر ایک نیا نظام قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں اور لازم ہے کہ ایک ایسے نئے نظام میں بعض ایسی باتیں ہوں جو خاص طور پر ہم غیر معتقدین کو بُری اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی روس میں اشتراکیت انسانی ترقی کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ اور خاصی حد تک ایک کامیاب اشتراکی تجربہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے ہر مُلک میں اور بالخصوص نوجوانوں میں اِس کے کروڑوں نام لیوا ہیں۔ کئی اشخاص کو راقم کی طرح اپنے متعلق یہ تجربہ ہوگا کہ اُن کا دماغ تو مانتا ہے کہ بات ٹھیک ہے مگر دل ہاتھ آئی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ اشتراکیت ہمارے ملک میں فی الحال ایک حد تک بعض غیر اشتراکی تحریکات سے وابستہ ہے جس کے باعث وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر نہیں آتی اور غریبوں کی اُن ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی جو روز و شب اپنی دردناک آواز میں اُسے پکارتی ہیں۔

آخر میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ رُوس کی اشتراکیت کا تجربہ جس قدر حیرت انگیز اور کامیاب ہے اُسی حد تک شاید مارکس ہی کی "توجیہی منطق" کے اضدادی نظریے کے مطابق اس کے خلاف دُنیا میں اس وقت ایک زبردست تحریک برپا ہو گئی ہے۔ یہ فاشیت ہے۔

فاشیت جو جرمنی میں نازیت کہلاتی ہے اور جو اس وقت ہسپانیہ میں جنرل فرینکو کے جھنڈے تلے کامیابی حاصل کر رہی ہے اطالیہ کے آمر مسولینی اور اُس کے ہم خیالوں کے دماغ کا ایک شگوفہ ہے۔ لیکن یہ پھُوٹا کیسے؟ جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جرمنی پر جو سختیاں کیں اور اطالیہ سے جو بے اعتنائی برتی اُس کی وجہ سے اِن قوموں کی خودداری کو ٹھیس لگی اور اُس نے قومیت اور فاشیت کے پہلو میں جا پناہ لی۔ فاشیت اشتراکیت کی ضد ہے۔ فاشی مساوات کے منکر ہیں، اُن کے ہاں عورت کے لئے صرف اپنے گھر کا حلقہ مخصوص ہو جاتا ہے۔ وہ سرمایہ دار اور مزدور کے فرق کو دائمی سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اکثریت انسانی سوسائٹی کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ سیاست رُوحانی و اخلاقی قوتوں کا مظہر ہے اور وہ

صرف حال سے بلکہ ماضی سے بھی وابستہ ہے۔ فاشیت کا سیاسی نظام مطلق العنانی کے قریب ہے۔ چنانچہ اسی لئے اشتراکیوں اور فاشیوں کا آگ اور تیل کا سا بَیر ہے۔ اشتراکی فاشیت کو ڈوبتی ہوئی سرمایہ داری کا ایک مُبلبلہ سمجھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ گو فاشیت یا نازیت نے دُنیا میں اطالیہ اور جرمنی کا گھٹا ہُوا وقار بڑھا دیا ہے اور انگلستان سے طاقتور ملک بھی اُن سے دبنے لگے ہیں تاہم انسانی نقطۂ نظر سے اِن ملکوں میں نفس کی آزادی کا قلع قمع کر دیا گیا ہے اور جنگ اور شہنشاہیت کے فتنے کو از سرِ نو جگا دیا گیا ہے۔ رُوس گو جنگ کے لئے تیار ہے لیکن دل سے صلح چاہتا ہے اُدھر جرمنی اور اطالیہ ہرچند کہ اُن کی جوع الارض دوسری شاہنشاہیت پسند قوموں سے زیادہ قابلِ نفرت نہیں وہ دُنیا میں جاپان کے ساتھ مل کر اَوروں کی آزادی سلب کرنے اور جنگ کے جذبات کو بھڑکانے کا شر انگیز کام سرانجام دے رہے ہیں۔

غرض ایک طرف اشتراکیت ہے دوسری طرف فاشیت اور ان کے قریب ہی غیر فاشی شاہنشاہیت اور سرمایہ داری بھی برابر اپنا پھریرا اُڑا رہی ہے۔ انگلستان عجیب کشمکش و پیچ میں ہے وہ سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا سب سے بڑا سردار ہے لیکن حالات اُسے فرانس اور رُوس کی جانب داری پر مجبور کر رہے ہیں۔ تاہم وہ دونوں فریقوں کی جانب کبھی صلح صفائی سے اور کبھی سرد مہری سے دیکھتا ہے اور جنگ کو ملتوی کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہے۔ وہ اور امریکہ اشتراکیت اور فاشیت دونوں سے مُنہ موڑ کر اپنی جمہوریت کا راگ الاپ رہے ہیں۔ اِدھر کچھ خود مختار کمزور یا غیر جانب دار قومیں ہیں اور کچھ محکوم حساس قومیں۔ اِس وقت یہ کھچڑی پک رہی ہے اور گو اشتراکی اور فاشی اپنی اپنی کامیابی کا کامل یقین رکھتے ہیں لیکن باقی ماندہ دُنیا سر جُھکائے سوچ رہی ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟

یہ ہیں دُنیا کے سیاسی اور معاشی حالات اور یہ ہیں اشتراکیت اور فاشیت اور شہنشاہیت کے نظریے اور اُن کی عملی صُورتیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ہوش مند انسان کو جو الگ کھڑا ہو کر اس درد بھرے تماشے کو دیکھ رہا ہو کیا سمجھنا اور کیا کرنا چاہیے؟ اشتراکی اور فاشی تو اس سوال پر سوال کرنے والے کو محض ایک نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اشتراکی صاف صاف کہتے ہیں اور غالباً یہی فاشیوں کا خیال ہو گا کہ کوئی شخص ہمارے نظریے کو نہیں سمجھ سکتا جو اس پر خود عمل نہ کرے۔ اگر ایسا ہے تو مزید گفتگو فضول ہے لیکن ہم میں سے وہ جو ابھی محض مفکر ہی ہیں اور جو انفرادی آزادی کے قائل ہیں کم از کم اپنے نزدیک حق رکھتے ہیں کہ اس کشمکش میں اپنی ایک جُداگانہ رائے قائم کریں اور سوچیں کہ اُنہیں کیا کرنا چاہیئے؟ [1]

یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں اس وقت ایک سخت کشمکش برپا ہے پُرانے خیالات بوسیدہ ہو رہے ہیں اور رسم ماننے والے زمانے اکثر مٹ چکے ہیں۔ دُنیا کے سنگین دل میں عدل و انصاف کا تیر لگ چکا ہے اور اب وہ کسی طرح ایک انسان اور دوسرے انسان میں اتنا فرق و تفاوت دیکھنے کا روادار نہیں رہا۔

قوموں کا ایک دوسرے پر اور مردوں کا عورتوں پر، عالموں کا جاہلوں پر، طاقتوروں کا کمزوروں پر، امیروں کا غریبوں پر حکمرانی کرنا اور اُس انداز میں حکمرانی کرنا جو سدیوں سے نوعِ انسان کا شیوہ رہا ہے اب دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اب یہ زنجیریں کٹ کے رہیں گی۔ ایک فرعون یا کسی نیک

---

[1] نوٹ: ہندوستان میں اشتراکیت کا مسئلہ ایک جُداگانہ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اُس پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔

پارسا کا بھی اپنے محل یا مکان میں عشرت یا غفلت میں غرق رہنا اور اُدھر ایک مفلس کا اپنے فاقوں پر قناعت کیے رہنا، اُن کے لئے جو سمجھتے اور دیکھتے ہیں، اُس غفلت اور اِس قناعت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ نوعِ انسان کے معاشی نظام کی تبدیلی اب لازم ہو گئی ہے اور یہ تبدیلی بڑی حد تک انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ ایک اشتراکی کتاب ہے کہ آسمان کے تارے سارے کے سارے اپنی گردش میں اشتراکیت کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن ہم محض تاروں پر بھروسا کر کے اپنے پاؤں توڑ کے نکمے نہیں بیٹھ سکتے۔ آخر کار کیا ہو گا ہمیں اس سے کیا غرض؟ "آخر کار" کی نسبت تو یہ امر یقینی ہے کہ آخر کار ہم سب کے سب مر مٹ جائیں گے"۔ لہٰذا ہمیں تو اب عمل کرنا ہے ابھی جلد۔ اور ہم بازی جیتیں گے تو اور کسی صورت سے نہیں بلکہ صرف اپنی دور اندیشی سے اور ہمت سے اور صبر سے اور انتہائی جوش و خروش سے!"

یہ سب کچھ درست ہے اور اشتراکیوں کا یہ جوش لائقِ ستائش ہے کیونکہ وہ اشتراکیت کے دل سے قائل ہیں اور اُس کے سچے عامل ہیں لیکن ہم جو اُن کی تعریف کرتے ہوئے بھی اُن سے علیحدہ ہیں، سمجھتے ہیں کہ انسان صرف روٹی کھانے اور تن ڈھکنے اور ایک چھت کے نیچے سو رہنے ہی کے لئے نہیں بنا۔ امیر غریب کا امتیاز ایک ظلم ہے اور آج دُنیا کے کونے کونے سے انصاف کی پُکار سنائی دے رہی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ نرا سوکھا انصاف بھی تو انسانیت کے لئے کافی نہیں۔ فرد کی آزادی ہاں ضرور! لیکن وہ بھی محض معاشی آزادی نہیں بلکہ آزادی جبلی اور نفسی اور رُوحانی!! اور خود بھی ایک راہ پر چلنے کا بلکہ کسی شے کے لئے جان پر کھیل جانے تک کا اختیار اور ایک ایسی فضا میں سانس لے سکنا جو سرتاسر آزادی اور محبت سے معمور ہو جہاں ایک وسیع تخلیقی مقصد جس کا لازماً محض اسی مادی دُنیا سے تعلق نہ ہو ہر گھڑی انسانی نفس کے سامنے منڈلاتا ہے مختصر یہ کہ جہاں انسان آزادی اور فیاضی سے اپنی زندگی بسر کرے اور اُس سے حتی المقدور مطمئن ہو ——— یہ ہے وہ نصب العین جو ایک سچے انسان کا ہونا چاہئے۔ اب کوئی اِسے اشتراکیت یا اشتمالیت کہہ لے یا جمہوریت یا رُوحانیت پکارے۔ سچ یہ ہے کہ یہی ہے زندگی کا صحیح نصب العین اور ہر دلیر اور دیانت دار انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں میں اِن خیالات کی اشاعت کرے اور جہاں تک ہو سکے امن کے ساتھ اِس پر عمل کرے!

بشیر احمد

اشتراکیت	Socialism
ذرائع پیدائش	Means of Production
تقسیم	Distribution
پیداوار	Production, Product
نراجی اشتمالیت	Anarchist communism
سرمایہ داری	Capitalism
اشتمالیت	Communism
مثالی ریاست	Ideal state
ردِّ عمل	Re action
اشتمالی اعلان	Communist Manifesto
تجزیۂ نفس	Psycho-analysis
تاریخ کی مادی تشریح	Materialistic Interpretation of History
ترجیحی منطق	Dialectic Logic
حرکی	Dynamic
اضداد	Contradictions
جاگیرداری نظام	Feudal System
آمرین	Dictators
مبادلہ	Exchange
"گوز پلین"	Gozplan
منصوبہ بندی	Planning
پنج سالہ منصوبہ	Five Years' plan
صارفین کی امدادِ باہمی کی انجمنیں	Consumers Cooperative Societies

آج

(نوروز)

آج میں ہوں اور میری زندگی
زندگی، رخشندگی، تابندگی!
سامنے پھیلا ہوا ہے اِک جہاں
آج میں ہوں اور زمین و آسماں!
دیکھ اے دِل دیکھ اُفق کی سمت تُو
ہے طلوعِ آفتابِ آرزو!
کیا ہوا کیا روشنی ہے کیا فضا
رُوح پرور دل کُشا جنّت نما!
آگیا بس آج جینے کا مزا
زندگی ہے اِک نظارہ آج کا
دِل میں اُٹھتی ہیں اُمنگیں صد ہزار
زندگی! اے بحرِ ناپیدا کنار

بشیر احمد

اُستاد اور شاگرد

اُستاد نے گھُرکی دی اور غائب ہوگیا کم ازکم اس تصویر میں غائب ہے اور شاگرد کوئی حیران ہے کوئی خفا ہے اور اکثر ڈر گئے ہیں، جھجک رہے ہیں۔ اِدھر دُنیا اب محض "جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر" کہہ کر مطمئن نہیں ہوجاتی بلکہ دیکھنے والے زیادہ تر اس حیرانی اور خفگی اور ڈر اور جھجک کے سمجھنے والے اُن سے ہمدردی رکھنے والے اور اِن کی مدد کرنے والے ہیں۔

وہ زمانہ گیا کہ جنابِ اُستاد کی سخت کلامی اور سخت گیری آسمانی رہنمائی سے تعبیر کی جاتی تھی اور ماں باپ بھی اپنے بچے کو پٹتے دیکھ کر اور اِسے ایک روحانی ریاضت جان کر باعثِ سعادت تصور کرتے تھے۔ اب تو ایک غلط اندازِ نظر بھی اُستاد کے لئے ایک گناہِ کبیرہ سمجھی جاتی ہے کبھی اُستاد کی مطلق العنانی تھی، اب شاگرد کی آزادی کا زمانہ ہے۔ اُس وقت شاگرد کو قدم قدم پر اُستاد کے تیور دیکھنے پڑتے تھے۔ اب اُستاد کو بات بات میں شاگرد کا نبض شناس بننا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ اُستادی شاگردی کا زمانہ حجریہ ختم ہوچکا، اب اُستاد ایک ہمدرد رہنما ہے جسے خود روز بروز فطرت شناسی کا سبق پڑھنا ہے اور یہ سبق وہ شاگرد کے ذریعے سے پڑھتا ہے اور ہر شاگرد اُس کے لئے قدرت کی ایک جُداگانہ مقدس تصنیف ہے جس کا ایک ایک ورق دیکھنے والے کے لئے روپہلی اور سنہری ہے۔ نہیں نہ اُستاد نہ شاگرد بلکہ خاندانِ انسانیت کے دو فرد، ایک بڑا دوسرا چھوٹا، بڑا تجربہ کار اور شاید عقلمند، چھوٹا نازک احساس اور یقیناً معصوم! پھر بڑے کو چھوٹے پر فوقیت کیسے ہوسکتی ہے؟ اُسے فخر کرنا چاہیئے کہ اُسے اِس کی خدمت و رہنمائی کا موقع ملا۔

یہ ہیں شاگردوں اُستادوں کے نئے حقوق و فرائض لیکن گو خیالات اکثر نئے ہو رہے ہیں عمل ابھی، کم ازکم ہماری نیم پرانی دُنیا میں پُرانے خیالوں ہی پر ہے۔ اس لئے زیرِ نظر تصویر ہمارے حالات کے عین مطابق ہے۔ اُستاد نے گھُرکی دی اور محض ذراسی دیر کے لئے مُنہ پھیرا اور اب جو پھر دیکھیگا اور شاگردوں کے چہروں کو دیکھیگا تو ضرور پھر ایک گھُرکی دیگا اور یہ گھُرکیوں اور لرزشوں کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ اور کہا جائے گا کہ یہ ہمیشہ سے یونہی تھا ہے اور رہے گا! ۔ اِس "ہمیشہ" نے، اِس پُرانے تجربے نے، اِس انسانی فطرت نے تو ہر انسان کو اس قدر تنگ کیا ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد، انسان نے خود اپنی فطرت پر گولہ باری شروع کردی ہے کہ یا یہ بدلے یا تباہ ہوجائے اور فطرت جو زندہ رہنا چاہتی ہے، جو زندہ رہنے کے لئے بنی ہے، بدل سکتی ہے بدلنا چاہتی ہے بدل رہی ہے اور بدل کے رہیگی۔

اس کے علاوہ فطرت کو کسی نے ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، جو موٹی سی بات سمجھ میں آگئی بس اُسی کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا لیکن اب تو بات بات میں باریکیاں نظر آنے لگی ہیں اب تو پانی کی دھار سے پتھر کی لکیریں بھی مٹا چاہتی ہیں!

یہ شاگرد پیچھے آنے والی نسلوں کے ہمدرد اُستاد اور شفیق باپ ہوں گے۔ اے آج کے اُستادو! ان کل کے رہنماؤں کے آگے ادب نہ سہی محبت سے بات کرو!

بشیر احمد



گھرکی

ہمایوں گولڈ میڈل مشاعرہ

آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کی یادگار

۱۹ ر نومبر ۱۹۳۷ء (جمعہ) کی شام کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کے ہال میں ایک عظیم الشان انعامی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت آنریبل سر عبد القادر نے فرمائی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کے طلبہ کو اس انعامی مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اور بہترین نظم کیلئے میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء ایڈیٹر ہمایوں نے اپنے والدِ محترم کی یادگار کے طور پر "ہمایوں گولڈ میڈل" کے نام سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وائی، ایم سی، اے کی طرف سے ایک نقرئی تمغہ اس طالب علم کو دیا جائے گا جس کی نظم کو حاضرینِ جلسہ کثرتِ آراء سے بہترین قرار دیں گے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پیشتر حاضرین کو اپنی اپنی رائے درج کرنے کے لئے کاغذات تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

سب سے پہلے صدرِ محترم نے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں مرحوم کے متعلق ایک تقریر کی جس میں ممدوح کی زندگی کے اخلاقی، علمی و ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد میاں بشیر احمد صاحب نے "کلامِ ہمایوں" کے چند نمونے پیش کئے جن سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

پھر انعامی مقابلے کی دس بہترین نظمیں پڑھی گئیں۔ طلائی تمغے کے متعلق تین ججوں نے جلسے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا جلسے میں صرف اس کا اعلان کیا گیا۔ "نقرئی تمغے" کے متعلق آراء شماری کی گئی اور جناب صدر نے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل طلبہ کو انعامات دیئے۔

۱۔ "طلائی تمغہ" (اوّل انعام): سید ضمیر جعفری اسلامیہ کالج لاہور۔ نظم "گاؤں کی ایک شام"

۲۔ "جذباتِ ہمایوں" (دوسرا انعام): برجندر سنگھ سیال دیال سنگھ کالج لاہور۔ نظم "بھائی کا نوحہ"

۳۔ "نقرئی تمغہ" (سامعین کا انعام نمبر ۱): سید فیضی جالندھری سابق متعلم گورنمنٹ کالج لاہور۔ نظم "تلوار"

۴۔ "جذباتِ ہمایوں" (سامعین کا دوسرا انعام): اشرف ریاض جمیل۔ سابق متعلم گورنمنٹ کالج لائل پور۔ نظم "درۂ خیبر میں چند لمحے"

مشاعرہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ حاضرین کے فیصلے پر انعام دیئے جانے کی جدت کو بہت پسند کیا گیا جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے سامعین کثیر تعداد میں تشریف لائے تھے اور ہال میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس مشاعرہ کی چند نظمیں ناظرینِ "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے آئندہ صفحات میں درج کی جاتی ہیں۔

(بی۔ ایل۔ رلیا رام۔ جنرل سیکرٹری وائی۔ ایم سی۔ اے لاہور)

گاؤں کی ایک شام

از سید ضمیر صاحب جعفری

لہلہاتے کھیت اور اُن پر شفق کی سُرخیاں — آسماں پر منتشر یہ ننھی ننھی بدلیاں

اک کھُلا میدان تا حدِ نظر پھیلا ہوا — غرقِ شعریت ہوائیں، بے خودی پرور فضا

اِک طرف ننھے کبڈّی کھیلنے والوں کا شور — اور ڈھلانوں میں اُدھر برسے ہوئے پانی کا زور

ڈاب پر معصوم و سادہ لڑکیوں کی ٹولیاں — میٹھے میٹھے قہقہے اور پیاری پیاری بولیاں

پانی بھرنے والیوں کے پاؤں کی یہ نرم چاپ — یہ دُھندلکا شام کا، یہ دونوں وقتوں کا مِلاپ

دُھندلی دُھندلی ٹیڑھی دیواریں یہ گارے کے مکاں — کچھ گھروں میں جل رہی ہیں دھیمی دھیمی بتّیاں

روٹی پکنے کی یہ آوازیں، یہ تنوروں کی آگ — گھر کو واپس آتے چرواہوں کے درد انگیز راگ

دُور قبرستان سے "ہیر" گانے کی صدا — گھونسلوں میں طائروں کے پھڑپھڑانے کی صدا

شام اور یہ شام کی دلکش ملاحت ریزیاں — موسمِ باراں کی کافر ولولہ انگیزیاں

یہ ہرے کھیتوں پہ اِک رومانیت چھائی ہوئی — پتّی پتّی اپنی رعنائی پہ اترائی ہوئی

کاش اِن لمحات میں وہ انجمن آرا بھی ہو

لُطفِ نظارہ ہے جب وہ جانِ نظارہ بھی ہو

لہ ایک چشمہ کا نام

آہ ماں جایا!

(از برجندر سنگھ صاحب سیال)

جانے کیا ہوا ہے کیا دل کو — آج کچھ بھی نہیں مجھے بھاتا

جام و مینا کو کیا کروں ہمدم — دل میں وہ ولولے نہیں پاتا

لُٹ گئی دولتِ شکیب و قرار — صبر کرتا ہوں، پر نہیں آتا

ہوش بھی آہ ہو گیا رُخصت — عشق کے ولولوں کو ٹھکراتا

آج آنسو ہی بن رہے ہیں شعر

ورنہ کچھ بھی نہیں کہا جاتا

ہائے کم بخت مانتا ہی نہیں — جی کو باتوں سے کیسے بہلاؤں

غم کا دریا چڑھا ہوا ہے آج — کیوں نہ دل کو وہیں ڈبو آؤں

درد کی داد کون دیتا ہے — کِس کو سینے کے داغ دکھلاؤں

دلِ صد چاک کی زبوں حالی — کون مانے ہے، کِس کو سمجھاؤں

آج کچھ لُطف ہے تو رونے میں

کاش میں اشک بن کے بہ جاؤں

زیست میں درد ہے جدائی ہے — "ایسی باتوں سے کب رہائی ہے"

نام ہی نام ہے خدا کا فقط — اصل میں موت کی خُدائی ہے

بیکسوں پر جفائیں ڈھاتے ہیں — کیا یہی شانِ کبریائی ہے

حُسن میں کھیلتا شباب مِٹا — درد نے آگ سی لگائی ہے

ہم سے سُن اُس کا مرثیہ ہمدم

مرنے والا ہمارا بھائی ہے

اُس کی باتوں میں لوچ تھا، اِک لوچ — وہ زباں، وہ دہن، وہ لب نہ رہے

اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی — دل رُبائی کے آہ وہ سب نہ رہے

جل گئے اُس کے گھنگر لے بال — نہ رہے پیار کا سبب ان رہے
ہائے وہ اُس کے پیارے پیارے ہاتھ — کس طرح میں کہوں کہ اب نہ رہے

مرنے والوں کی خوبیاں بے سُود
آہ بیچارے آپ جب نہ رہے

وہ پلک بھی نہیں جھپکتا اب — گو یا نرگس کی مانگ لیں آنکھیں
سُرخ ڈوروں میں بھر گیا پانی — مِٹ گئیں ہائے وہ حسیں آنکھیں
چہرۂ زرد اُس کا سونا تھا — اور اُس پر تھیں دو نگیں آنکھیں
موت نے اُن کو کر دیا بے نور — اب دیکھیں گے دل نشیں آنکھیں

کیا کہیں ہم اُسے بُھلا نہ سکے
اُس نے گو ہم سے پھیر لیں آنکھیں

مئے اُلفت کا ایک متوالا — حُسنِ فطرت کا ایک شیدائی
پاکبازی میں ایک بے پروا گی — طبعِ سادہ میں ایک صحرائی
دردو غم میں ہر ایک کا ہمدرد — میرا بھائی، مرا جواں بھائی
موت کے ہاتھوں دن دہاڑے آہ! — اُٹ گئی زندگی کی رعنائی

اُس کے دم توڑنے کا حال نہ پوچھ
ہچکیاں لے رہی تھی برنائی

تجھ کو تیری خدائی کی سوگند — زیست کو برقرار رہنے دے
اُس کو جینے دے، یہ شباب کے دن — میرے پروردگار رہنے دے
ایک مستانۂ شباب کے بیر — ستم بے شمار رہنے دے
خوفِ صیاد اور بیمِ خزاں — یارب ایسی بہار رہنے دے

آہ! یہ اشک باریاں کب تک
دل پہ کچھ اختیار رہنے دے

تلوار

(از سید فیضی جالندھری)

آسمانی قہر ہے اس کی رگِ ضوریز میں
رہرووں پر بند کر دیتی ہے یہ راہِ حیات
شیر سے کڑیل جوانوں کو سُلا دیتی ہے یہ
خُونِ انسانی سے بھر لیتی ہے یہ اپنے ظروف
بھیرویں میں اس کی پوشیدہ ہے تاثیرِ "بہاگ"
اس کا سینہ ابر چھا جاتا ہے جب جنگاہ پر
کانپنے لگتے ہیں اس کے نام سے اورنگ و تاج

خون کی دھاریں چھپی ہیں اس کی نوکِ تیز میں
کشمکش سے زندگانی کو دلاتی ہے نجات
زندگی کو موت کا رستہ بتا دیتی ہے یہ
اس کی سُرخی سے لکھے جاتے ہیں تاریخی حروف
اس کی آنچیں سرد کر دیتی دُلہن کا ہیں سہاگ
بجلیاں یکساں برستی ہیں غریب و شاہ پر
ظلم سے لیتی ہے یہ اپنی روانی کا خراج

ہر طرف ایجاد کرتی ہے گلستاں لالہ رنگ — اس کے ہنگاموں سے اُٹھتی ہے شہادت کی اُمنگ
جنگ کی حدت ہے اس کے شعلۂ رخسار میں — نصرتوں کے بھید پوشیدہ ہیں اس کی دھار میں
اس کے زیر و بم پہ ہوتا ہے قیامت کا گماں — کوندتی ہیں اس کی ہر جنبش میں لاکھوں بجلیاں
یوں چمکتی ہے جہنم مرحبا کہنے لگیں — ریگ زاروں میں لہو کی ندیاں بہنے لگیں
بزدلوں کی ہے یہ دشمن، سورماؤں کی رفیق — اس کے ڈر سے زہرۂ دوزخ بھی ہوتا ہے رقیق
برق کی تندی رگ و ریشہ میں اس کے عام ہے — ایک بار اس کا چمکنا جنگ کا پیغام ہے
حاکموں کو یہ سکھاتی ہے حکومت کا شعور — اس کے بل بوتے پہ نازاں ہے سپاہی کا غرور
اس طرح پھرتی ہے میدانوں میں بل کھاتی ہوئی — گردنیں شاہوں کی جھک جاتی ہیں تھراتی ہوئی
اللہ اللہ اس خنک بجلی کے لہراتے شرار — راہواروں سے اُتر پڑتے ہیں نیچے شہسوار
نعرۂ خونیں ہے پیدا اس کی ہر جھنکار سے — لوہا منواتی ہے اپنا نخوتِ اغیار سے
موجِ خوں سے سینچتی ہے سرزمینِ جنگ کو — سُرخیاں دیتی ہے یہ مردوں کے نام و ننگ کو

گو عروسی شکل ہے، خوئے عروسانہ نہیں
کاٹ میں اس کی رعایت کا کوئی خانہ نہیں

درۂ خیبر میں چند لمحے

(از اشرف ریاض صاحب جمیلی)

شام کا رنگیں سماں اور تھی شفق ہنگامہ خیز — جھک گیا تھا شمس سجدے میں ہوا تھی عطر بیز
شام کی دُھندلاہٹوں سے بڑھ رہی تھی آبِ حُسن — پی رہا تھا آنکھ سے شاعر شرابِ نابِ حُسن
ہو چکے تھے کیف زا نغموں کے ہنگامے خموش — بڑھ رہا تھا دشت میں سرمست سناٹوں کا جوش
تھی نظر میں بے خود و خاموش منظر کی بہار — سو چلے تھے مست جنگل کے سہانے شاہکار
جا رہے تھے کھیت سے دہقان بستی کی طرف — آ رہی تھی خامشی گردوں سے پستی کی طرف
بے خود و معصوم نظریں منظروں کو چومتی — اس فرشتوں کی زمیں میں چار سُو تھیں گھومتی
جا رہا تھا سرحدی افغان بارعب و جلال — ایک کاندھے پر تھی بندوق ایک کاندھے پر کدال
کارتوسوں کا پٹا سینے سے لٹکاتے ہوئے — زندگی کو زندگی کا راز سمجھاتے ہوئے

دل میں آزادی کا جذبہ جسم پر میلا لباس — بھوک اور افلاس کا رُوندا ہوُا چہرہ اُداس

کالجوں کے شوخ لڑکوں کو تھا تکتا اس طرح — حاکموں کو بے گنہ مجبور قیدی جس طرح

ریل گاڑی کو تھا سامانِ تعیش جانتا — اپنی آزادی غلامی سے بُری گردانتا

ظاہراً آزاد باطن بھوک کا مارا ہوُا — دل میں حسرت لب پہ مرگِ ناگہانی کی دُعا

مجھ پہ اس مغموم منظر سے ہوُا گہرا اثر — اشک بھر آئے مری آنکھوں میں اُس کو دیکھ کر

گر زمانے کا یونہی بڑھتا گیا کبر و غرور — عرش تک ہوگی رسائی ان کے نالوں کی ضرور

منعموں کے آج تک سہتے چلے آئے جو ناز — پاس تیرے کچھ نہیں ان کے لئے اُے کارساز

کھول دے اُن پہ بھی اب تو بابِ رحمت کھول دے
موتیوں کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو تول دے

ایک طویل نظم سے اقتباس :—

کوئل

(از محمد منور صاحب قریشی عازم الہاشمی)

سُن لی گئیں دنیا کی دُعائیں — چلنے لگیں پورب سے ہوائیں

یوں اُٹھیں ساون کی گھٹائیں — جیسے ناگ کہیں لہرائیں

بگلوں سے بھرپور فضا ہے — ٹکڑے ٹکڑے چاند ہوُا ہے

فوج نہیں بگلوں کی یہ آئی — اُڑتے ہیں دُودھ اور بالائی

بادل بچھڑے ہیں ہم جولی — مِل کر کھیلیں آنکھ مچولی

گاؤں میں جتنے چھوٹے بڑے ہیں — سب میدان میں آ پہنچے ہیں

آڑ میں ہو کر، چھپ کر، بچ کر — تاک کے وہ گنجے کے سر پر

نیلے انڈے پھوڑ رہے ہیں — جیٹھ کا جادُو توڑ رہے ہیں

چھوٹے بچے بھولے بھالے — گورے گورے کالے کالے

چھوٹے چھوٹے بال ہیں اُن کے — پھول سے نازک گال ہیں اُن کے

ہیں معصوم اور پاک رشی سب — چھوٹے چھوٹے گاندھی جی سب

ایک لنگوٹی اور اِک کُرتا — ہے اُن کا بس سارا بانا

ہاتھ میں چکّر گھوم رہا ہے — پہلو میں دل جھوم رہا ہے

اُمڈا ہوُا ہے حُسن کا دریا — ڈھونڈ رہا ہے پریم کی نیّا

سوز سے خالی ساز ہے دُنیا — سازِ اِک بے آواز ہے دُنیا

حُسن ہے راگ اور عشق گویّا — لیکن سُننا، ٹھیرو بھیّا

دیکھو یہ آواز ہے کیسی — درد میں ہے سُر ڈوبی ہوئی سی

سینے سے منہ کو دل لپکا — کوئل بولی۔ ہاں میں سمجھا

کوئل ہاں آموں کی رانی — کوئل ہاں۔ ساون کی جوانی

جس کو آپ سنیں نارائن • کوئل ہے وہ سندر گائن

کوئل ہے یا جوگن کوئی پریم رنگ کی روگن کوئی
چھوڑ چکی دنیا کے دھندے توڑ چکی لالچ کے پھندے
دُنیا من سے بھلائے ہوئے ہے مولا سے لگائے ہوئے ہے
ہمجنسوں سے دُور پڑی ہے پریم نشے میں چُور پڑی ہے
گیتوں میں دریا کی روانی سُن سُن کر موجیں ہوں پانی
اور آواز میں رُعب ہے ایسا وصف ہے جو مولا والوں کا

بیٹھی ہے آموں کی گپھا میں مست ہے بس بھگوان کتھا میں
دُنیا والے لوبھی بندے تن کے چنگے من کے گندے
لوبھ ہے اور اپرادھ ہی دُنیا شرم وحیا کی سمادھ ہے دُنیا
طور ہے اس دُنیا کا کمینہ غرق ہے یاں نیکی کا سفینہ
اللہ کے دل میں گھر کر لو
پھر ساری دُنیا سر کر لو

طائرِ قفس نصیب سے

(از روشن لال ٹنڈن روشن لکودری)

باغ کی پیاری فضا میں گھومتا رہتا تھا تُو
غنچہ ہائے خوبرو کو چُومتا رہتا تھا تُو
کیف سے مخمور کرتی تھی تجھے کالی گھٹا
شاخ پر جھولا جھلاتی تھی تجھے ٹھنڈی ہوا
بال و پر پھیلا کے سطحِ چرخ پر اُڑتا تھا تُو
جس طرف جی چاہتا تھا اُس طرف مڑتا تھا تُو
مُنہ اندھیرے جب کبھی گلگشت کو جاتا تھا تُو
فرش اِک سبزے کا زیرِ پا بچھا پاتا تھا تُو
جب درختوں کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا تُو
عشرتِ دُنیا سے بیگانہ سا ہو جاتا تھا تُو
نُور برساتا تھا ہر دم آسماں تیرے لئے
گیت گاتی تھیں خوشی سے ندّیاں تیرے لئے
گلستاں تیرے لئے اِک حُسن کا بازار تھا
ہر گُلِ رعنا ترا محبوب تھا دلدار تھا
اپنی میٹھی تان سے جب تُو سناتا تھا ملہار
یہ گماں ہوتا تھا اب کو آئی ساون کی بہار
رشکِ فردوسِ بریں تھا تجھ کو اپنا آشیاں
پتہ پتہ صحنِ گلشن کا تھا تیرا راز داں
تُو بلائے رنج و غم سے بے خبر تھا شاد تھا
دہرِ پُر آشوب کی ہر قید سے آزاد تھا

کس کو یہ معلوم تھا ہوگا تو پابندِ قفس
چھوٹ جائیں گے کسی دن تجھ سے تیرے ہم نفس

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اُس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اُس نے کبھی سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اس کے باوجود اُسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ لاہور کے باہر اور لاہور کے اندر کیا ہو رہا ہے اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے سپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر بڑے مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں سپین کے اندر جنگ چھڑ جائیگی" اور جب گاما چودھری نے اُس سے یہ پوچھا تھا کہ سپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے یہ جواب دیا تھا "ولایت میں، اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر ٹانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اُس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور اُس کو بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی پیر کی بددُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چھریاں چاقو چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دُکھایا تھا اور اُس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی "جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے" ــــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے، ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں میں کہتا ہوں، اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا، یا وہ رُوس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تکڑا آدمی ہے، لیکن رہے گا ہندوستان غلام ــــ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کرتے رہیں گے۔"

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اُس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اُس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔

اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کُتّا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اُن کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ کسی گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی تھی، نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُن کے لال جھُرّیاں پڑے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کبھی کسی شرابی گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اُس کی طبیعت مکدر رہتی تھی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگرٹ پیتے، یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا تھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں نے۔ یوں رُعب گانٹھتے ہیں، گویا ہم اُن کے باوا کے نوکر ہیں۔۔۔"

اس پر اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا تھا۔
"شکل دیکھتے نا تم اُس کی۔ ۔ ۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہو ـــــ بالکل مُردار، ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ اُس کی کھوپری کے پُرزے اُڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"۔ ۔ ۔ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے میں تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں تو رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے ـــــ تیری قسم جان میں جان آجائے"۔

اور جب ایک روز اُستاد منگو نے کچہری سے اپنے ٹانگے پر دو سواریاں لادیں اور اُن کی گفتگو سے اُسے پتا چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے، جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ـــــ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی"۔

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے"۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا رہتا تھا اور اُسے چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اُس روز وہ بار بار، پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں

کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا: چل بیٹا ــــ چل بیٹا ــــ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو اُن کے ٹھکانے پر پہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دُکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر اُن کو چُوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اُس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بہت بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ــــ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کیلئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا، لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے، نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دُنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق، جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے، غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا" بار بار گونج رہا تھا اور اُس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اُس نے اُن مارواڑیوں کو گالی دی "۔ ۔ ۔ ۔ غریبوں کی کھٹیا میں گھُسے ہوئے کھٹمل، ــــ نیا قانون اِن کے لئے کھولتا ہُوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اُس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ــــ سفید چوہوں (وہ اُن کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں، نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈّے میں داخل ہُوا تو اُستاد منگو بڑھ کر اُس سے ملا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر۔ ۔ ۔ ۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ــــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کی بابت اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تُو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ رُوس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہیگا۔"

اُستاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں، اسی لئے اُس نے "رُوس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ اُنہیں "رُوس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی ــــ اُستاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے

بم ساز پکڑے گئے ہیں، یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو وہ ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:-

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے، جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنا نہ دیکھا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہی نہیں"۔

اُن بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، چونکہ اُس میں بیشتر لفظ انگریزی کے تھے اس لئے اُستاد منگو صرف اُوپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اُن کا وطن آزاد ہو چنانچہ اس خیال کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اُن دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کرکے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سُنا:-

"نئے آئین نے میری اُمیدیں بڑھا دی ہیں۔ اگر . . . صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائیگی"۔

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں"

"وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں اُن میں کچھ تو کمی ہو گی"۔

اس گفتگو نے اُستاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون . . . !" وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اُس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا، وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اُس کے حق میں بہت کچھ سُنا مگر اُس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اُس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی، اُن سے اُس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہواؤں میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اُس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی۔ اُس کی نگاہیں آج خاص طور پر ہر چیز میں نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں، مگر اُسے سوائے اُس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی ہوئی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک، اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اُس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی . . . . . ان میں کونسی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے، دُکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں" اس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا:۔

"ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا۔"

جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے، مگر اُستاد منگو کو نہ جانے اُن کے لباس میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دُکانیں کھُل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دُکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی، اور منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے مگر اُستاد منگو کے لئے اِن تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا، ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے، اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اُس کے اُوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا:۔

"تُو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے، اُٹھ، ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے، یوں تختہ بنے رہنے سے

کچھ نہ ہو سکے گا۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اُس کی بیوی گنگا دئی اُس کی اس قسم کی بیقراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اُتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اُسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا، ٹھیک اُسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ اُن کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا پھندا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں، یا ہو جائیں تو اُس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کی اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سڑک پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اُسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا:۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ۔۔۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر اُستاد منگو نے سواری کو اُس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگرٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو اُنگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست پر سے اُٹھ کر پچھلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ۔۔۔ جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے یا آنے والی بات پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اُس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا گویا اُسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور اُستاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا، اُسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا بلکہ یوں کہئے کہ اس سوچ بچار میں غرق تھا کہ اُسے یوں معلوم ہوا گویا کسی سواری نے اُسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر اُسے سڑک کے اُس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اُسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اُستاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی اور جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا

جائے مگر بعد میں اُس کو یہ خیال آیا :- "اِن کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے ــــ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں، وہ اِن کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں ــــ چلو چلتے ہیں ؛

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگے کو موڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دِکھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا :-

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگٹا ہے ؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اُس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا تھا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اُس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اُس نے اُس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگرٹ سُلگا رہا تھا، مُڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو کی اور اُس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اُڑ گئیں۔

اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اُس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے، اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا گویا وہ اُستاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگٹا ہے یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ لفظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اُس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگ گئے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ لفظ اپنے مُنہ کے اندر ہی اندر دُہرائے اور ساتھ ہی اُسے پُورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اُس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی، اُسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پُرزے اُڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرا کرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگٹا ہے ؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں اُس کے چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا" اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے — کیا تم ؟"

"ہاں ہاں، پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کرچکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا "اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے"۔ اور اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اُس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے، پھر اُس کا گھونسا کمان میں سے تیر کی طرح اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اُس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ اس چیخ پکار نے اُستاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں . . . پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں — اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی مار سے بچایا۔ اُستاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا، اُس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی، مُنہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے — اب نیا قانون ہے میاں، — نیا قانون"

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی طرح کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے، راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون" "نیا قانون" چلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — قانون وہی ہے، پرانا!"

اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سعادت حسن منٹو

کشمیر میں خزاں کا ایک منظر

۱۵ اکتوبر کے بعد کشمیر میں خزاں کے آثار دکھائی دینا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ موسم تقریباً ڈیڑھ ماہ تک رہتا ہے۔ اس موسم میں سفیدے کے پتوں کا رنگ نہایت خوشنما زرد ہو جاتا ہے اور چنار کے پتوں میں نہایت لطیف اور نظر افروز سرخی پیدا ہو جاتی ہے۔ فضاؤں میں پاکیزگی اور پانیوں میں صفائی اور شیرینی آ جاتی ہے۔ غرض کشمیر کی یہ خزاں بھی عجیب قسم کی بہار لئے ہوتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار میں اسی موسم کے ایک منظر کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ——— آثر صہبائی

یہ زرد زرد سفیدے یہ سرخ سرخ چنار
یہ سرد سرد ہوائیں، یہ پانیوں کا نکھار

یہ مست مست فضاؤں میں کیف و ذوق و سرور
ہر ایک گھونٹ میں کیفیتِ شرابِ طہور

فلک پہ رنگِ شفق ہے کہ لالہ زارِ بہشت
خزاں کے رنگ میں ہی جلوہ گر بہارِ بہشت

پہاڑ دورِ خزاں میں جو برف پوش ہوئے
شفق کے فیض سے دامانِ گلفروش ہوئے

عجیب منظرِ دلکش ہے سطحِ دریا کا!
یہ آئینہ ہے شفق کے جمالِ زیبا کا

اس آئینہ میں اتر کر سنور گئی ہے شفق
نہا کے اور بھی گویا نکھر گئی ہے شفق

عجیب نور ہے دریا و کوہ و صحرا پر
ہے کس کے حسن کا پرتو یہ ارغواں منظر!

عجیب وادیٔ رنگیں ہے وادیٔ کشمیر
بہشتِ راحت و تسکیں ہے وادیٔ کشمیر

نگاہِ شوق یہاں کامیاب ہے ہر دم
کہ روئے حسنِ ازل بے نقاب ہے ہر دم

بہار ہو کہ خزاں، حسن جلوہ آرا ہے
غریقِ مستیٔ دیدار چشمِ بینا ہے

بہار اس کی بہشت اور خزاں ہے رشکِ بہشت
یہ کوہسار، یہ آبِ رواں ہے رشکِ بہشت

آثر صہبائی

پردہ

پردہ ایک نہایت عام فہم لفظ ہے۔ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کی وسعت کے باوجود، بہت کم لوگ اس کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں۔ اپنے سادہ ترین مفہوم میں، پردہ، جمادات، نباتات یا حیوانات یا دنیا کے کسی معلوم یا نامعلوم اور محسوس یا غیر محسوس مادے سے بنی ہوئی یا نہ بنی ہوئی ایک ایسی چیز ہے جو چھپانے یا ظاہر کرنے، توڑنے اور جوڑنے، گھٹانے اور بڑھانے یا حفاظت کرنے اور رُعب گانٹھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً پتھر یا اینٹ کا پردہ (یعنی دیوار) چھپانے کا کام بھی دیتا ہے اور علیحدہ اور جُدا کرنے کا بھی۔ جب وہ مکان کی بیرونی دیوار کی جگہ ہوتا ہے تو اس کا کام چھپانا اور حفاظت کرنا ہوتا ہے اور جب کسی کمرے کے اندر بنایا جاتا ہے تو یہ جُدا کرنے اور علیحدہ کرنے کا کام دیتا ہے۔ کپڑے کا پردہ چھپانے کے کام بھی آتا ہے اور دکھانے کے بھی۔ مثلاً تصویر کا پردہ، تصویر کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ عہدہ داروں کے کمروں کا پردہ، رعب جمانے میں مدد دیتا ہے۔ یہی پردہ کسی اور جگہ مثلاً کشتی میں لگایا جاتا ہے تو پھیلانے اور حرکت میں لانے کا باعث ہوتا ہے۔

دھات یا لکڑی سے بنایا ہوا پردہ، ان میں سے کسی ایک یا تمام اغراض کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔

حیوانات کے مادے سے بنے ہوئے پردے کے بھی کم و بیش یہی استعمالات ہیں۔ پیٹ کا پردہ، امعاء کو محفوظ رکھتا ہے۔ جھلی سے آواز پیدا کرنے کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ کان کا پردہ، حفاظت اور اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔

ایک پردہ ساز کا ہوتا ہے، جس کے معنے دراصل جھلی ہی سے مستعار ہیں کیونکہ اس سے بھی آواز نکلتی ہے۔

آنکھ کا پردہ، ذرا نازک ہوتا ہے، جو دکھانے اور دیکھنے کا کام دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر بصارت اور بصیرت کے مترادف ہے۔

ایک اور پردہ ہے، جو آنکھ کے پردے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ یہ الفاظ کا پردہ ہے۔ لیکن اس کا کام بھی عام پردوں کے زمرے سے خارج نہیں ہے۔ یہ کہیں دکھاتا اور کہیں چھپاتا ہے۔ کبھی وہ مفہوم کو چھپاتا ہے، کبھی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح کے چند اور نازک پردے ہیں، جیسے عقل و سمجھ کا پردہ، دل کا پردہ یا پردۂ غیب وغیرہ۔ چند پردے استعارے کے ہیں، جیسے پردۂ عنکبوت، پردۂ عالم، پردۂ خاک۔ اسی سلسلے میں یہ پردہ بھی دیکھنے کے قابل ہے جس کا ذکر حالی نے کیا ہے:

پردے ہزار وصل میں بھی درمیاں رہے   شکوے وہ سب سنا گئے اور ہم زباں رہے

بہرحال پردے میں دکھانے یا چھپانے یا دونوں کی مشترک اور متضاد خصوصیات موجود اور نمایاں رہتی ہیں، ورنہ شاید وہ پردے کی تعریف میں نہ آ سکتے۔

لیکن سب سے زیادہ وسیع مفہوم کا، ایک اصطلاحی پردہ ہے جو دنیا کی بعض قوموں میں، مختلف انداز سے رائج اور مستعمل ہے۔ اس اصطلاحی پردے کی ابتدائی اور انتہائی حدیں، بہت کم لوگوں کے ذہنوں میں معین ہوں گی۔ اس کی ابتدا نظر کے پردے سے ہوتی ہے

اور انتہا میں یہ مٹی، اینٹ، چونے، پتھر، لکڑی، لوہے غرض کسی شے کے ایک بھاری بھرکم پردے، مثلاً تیس پینتیس فٹ اونچی دیوار پر ختم ہوتا ہے یا اس کے برعکس سمجھ لیجیے۔ یعنی اس کی ابتدا تیس پینتیس فٹ اونچی دیوار سے ہوتی ہے اور انتہا، نظر کے پرلے پر۔ اس ابتدا اور انتہا کے درمیان، جس قدر کائنات سما سکتی ہے، وہ سب اس پردے کے اندر ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی اس کے مفہوم میں محض یہ چیز آتی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورت ہم جلیس نہ ہوں یا نسوانیت اپنی زینت کا تماشا نہ کرے یا اپنا سارا جسم، سوائے منہ اور ہاتھوں کے، پسِ پردہ رکھ کر آزادی کے ساتھ دُنیا کے کاروبار انجام دے۔ یا پھر یہ کام سفید، سیاہ، سرخ، نیلے، ہرے یا کسی رنگ یا ہر رنگ کے ایک غلاف میں ملفوف ہو کر انجام دے لیکن اسی انداز سے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

اس مفہوم میں یہ بھی آسکتا ہے کہ عورت، بغیر "پردے پر پردے اور چلمن پر چلمن" کی سواری کے کسی اور طرح گھر سے باہر نہ نکلے، اور جب نکلے تو پردے میں رخنہ ڈال کر یا چلمن کی تیلیوں سے مردوں کو نہ دیکھے یا مرد اس کو نہ دیکھیں۔

یا وہ مرد کو دیکھے، اور مرد اس کو نہ دیکھے

یا مرد اس کو دیکھے، اور وہ مرد کو نہ دیکھے

یا دونوں ایک دوسرے کو "دیکھیں اور نہ دیکھیں"

یا بالکل نہ دیکھیں۔

یا اگر دیکھ ہی لیں تو اس طرح دیکھیں کہ پردہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

اِس آخری جُملے کی توضیح بھی ضروری ہے۔

اکثر اوقات پردہ دار عورتوں اور مردوں کی، اتفاق یا نفاق سے آپس میں مٹ بھیڑ یا ٹکر ہو جاتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں، پھر دفعتہً، ایک پردے میں اور ایک "بے پردگی" میں بھاگ جاتا ہے۔ پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں کے درمیان پردہ نہیں ہے۔ ایسا عموماً عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں میں ہوتا ہے۔ انہیں میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے جس کا نقشہ شاعر نے اس شعر میں کھینچا ہے:۔

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا، کبھی ہوں میں پردۂ راز میں

مری اک حقیقتِ مشترک، ہے حقیقت اور مجاز میں

کبھی یہ ہوتا ہے کہ، نوکروں اور ملازموں سے، خواہ وہ کتنے ہی مردِ مذکر کیوں نہ ہوں عورت پردہ نہیں کرتی، پھر بھی وہ پردہ دار ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ غیر ملازمین (یہاں آزاد پیشہ مراد نہیں ہیں) یعنی ہم رُتبہ مردوں سے پردہ کرتی ہے۔

کبھی پردہ محض جانے پہچانے مردوں یا عورتوں سے ہوتا ہے۔ یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ "ایسے مقام پر کیا جاتا ہے جہاں جانے پہچانے لوگ موجود ہوں یا موجود ہو سکتے ہوں، اور کبھی یہ انجان مردوں سے ہوتا ہے" پہلے دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے اکثر محترمات کو گاؤں یا جنگل

بزرگِ خانداں

حجلۂ زرکار سے مہرِ مبیں نکلا نہیں
سامنے اب تک شعاعوں کا ہجوم آیا نہیں

نور پھیلاتا ہے جو اُس کا نہیں حاصل شہود
جلوہ فرما ہے مناظر میں ضیائے بے نمود

صُبحِ صادق میں ہے کچھ کچھ رُوزِ روشن کا اثر
یعنی اب نجمِ سحر بننے کو ہے وہمِ نظر

کیا سُہانا وقت ہے کِس درجہ دلکش ہے فضا
شاہدانِ قُدس کے انوار پر غش ہے فضا

رشکِ جنت ہے مجھے یہ مختصر سا خانہ باغ
مَیں نے اے ہمدم! یہاں عشرت کا پایا ہے سُراغ

کیوں نہ مَیں محسوس کرتا اس جگہ لُطفِ ارم
کس "بہار افزائے ہستی" کے یہاں دیکھے قدم

دیکھ! بیٹھے ہیں ادھر کُرسی پہ ابا جان، دیکھ
اور میرے ان عزیزوں کی شگفتہ شان دیکھ

جمع ہیں بھائی، بھتیجے، بھانجے، بہنوئی بھی
کیا نظر آتا ہے ان میں تجھ کو ناخوش کوئی بھی

صُبح کا یہ وقت، یہ مجمع عزیزوں کا یہ باغ
ہیں لبالب بادۂ عشرت سے پھولوں کے ایاغ

سایۂ شمشاد میں جو سرو قد استادہ ہے
دیکھ! وہ سب سے بڑا میرا برادر زادہ ہے

اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی اس طرف ہیں محوِ سیر
ساتھ اِن کے میرے بچے ہیں نہیں یاں کوئی غیر

دیکھ! کیسے شاد ہیں میرے یہ دونوں بھانجے
غیرتِ شمشاد ہیں میرے یہ دونوں بھانجے

جن سے والد ہیں مخاطب وہ مرے بہنوئی ہیں
ابنِ عم بھی ہیں، انہیں کہتا ہوں "دادا بھائی" ہیں

بھائی صاحب دھو رہے ہیں ہاتھ مُنہ، دیکھ اس طرف
کارنامے ان کے ہیں روشن کُنِ نامِ سلف

والدِ ماجد سے ہے ہم سب کی یہ ساری نمود
اس وجودِ پاک پر نازاں ہمارا ہے وجود

ہم پہ کب پڑتی نہیں اِن کی نگاہِ التفات
ہم ہی ہیں ان کی نظر میں "باقیات الصّالحات"

مرکزِ طلعت ہے "پیری کا یہ نورانی فروغ"
یاں نظر آتا ہے کامل ہم کو انسانی فروغ

"اجتماعی زندگی" میں "انفرادی شان" دیکھ
خانداں میں اس "بزرگِ خانداں" کی آن دیکھ

علی منظور
حیدرآبادی

نیمو

(۱)

ثاقب۔ حسینہ تو سبھی بن بیٹھتی ہیں مگر لُوسی کی بات ہی اور ہے۔

ناہید۔ اس میں کیا انوکھا پن ہے؟

ثاقب۔ عورت کیا ہے پیاری اداؤں کا مرقع ہے۔ بس دیکھتے چلے جاؤ۔

ناہید۔ ثقو۔ تم جس پر مرتے ہو تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہو۔ ہاں! تو کیا اب لوسی سے شادی کا ارادہ ہے؟

ثاقب۔ پھر وہی گنوارپن کی بات! شادی کا کیا تذکرہ ہے واللہ تم بھی دیکھو تو لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔

ناہید۔ تم تو کوئی جاٹ کی بھی بیاہ لاؤ تو اُس پر بھی میں فدا ہوں گی۔ مجھے باپ دادا کا گھر آباد دیکھنے کی آرزو ہے۔

ثاقب۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہندوستانی عورت کبھی عورت بن ہی نہیں سکتی۔ ہمیشہ نانی دادی پھوپھی خالہ بننے کی آرزو میں مرتی رہتی ہے۔ تم تو مجھ سے بڑی ہو، ماشاءاللہ بڑھ چڑھ کے فیشن ایبل ہو اور تمہارا بھی وہی دقیانوسی خیال ہے کہ باپ دادا کا گھر بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے خالی نہ ہو۔

ناہید۔ اچھا میں گنوار ہی سہی مگر جو لوسی نے تم سے شادی کی ٹھان لی تو پھر کیا کرو گے؟

ثاقب۔ (کچھ تامّل کے بعد) یہ تو تم نے بُری سُنائی مگر غالباً لُوسی میں یہ کمزوری نہ ہو گی۔

ناہید۔ سچ کہتی ہوں کہ میں اگر گنوار ہوں تو تم پرلے درجے کے احمق ہو۔ لوسی کا اگر شادی کا ارادہ نہ ہو تو وہ کیوں تمہیں یوں مُنہ لگائے۔ ماں انگریزن، باپ پارسی، اچھا سودا کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

ثاقب۔ واللہ مجھے تم سے اس قسم کی باتوں کی توقع نہ تھی۔ ساری دُنیا تمہاری خوش مذاقی کی مداح ہے۔ جو ہے سو مجھے مبارک باد دیتا ہے کہ ناہید جیسی روشن خیال آزادمزاج بہن کے بھائی ہونے کی مجھے عزت حاصل ہے، اور تم سے جو دل کی بات کی تو تم نے وہی شادی کا چرخہ چلا دیا۔

ناہید۔ سنئے ثقو میاں! روشن خیالی آزادمزاجی محض سوشل لطف کی باتیں ہیں۔ یعنی صرف کہنے کے لئے۔ جہاں بقائے نسل کا سوال ہو وہاں آزادخیالی کا کیا دخل۔ بھلا سوچو تو کہ تمہارے اور لوسی کے بچے ہم لوگوں کے بچوں سے کیا ہیں گے ہنٹنگ گھر بہت صاف ہو گا، بچے بہت گورے چٹے ہوں گے مگر ان کی زندگی کیا ہو گی؟ مسجد کے پاس سے سوا فرنگی بن کر گزر جائیں گے۔ بلا سے ہم لوگ ملحد سہی مگر مسلمان تو ہیں۔

ثاقب۔ مولانا حاجی ناہید صاحبہ۔ اگر آپ کے وعظ کا یہی رنگ ہے تو میری طرف سے شادی کو طلاق ہے۔ یہ خوب رہی کہ بچے تو ہم پیدا کریں اور کام وہ اور لوگوں کے آئیں۔

ناہید۔ تو میری بات ٹھیک نکلی نا کہ تم شادی پر آمادہ ہو۔ کیا لوسی سے تم نے سوال کر دیا؟

ثقو۔ قسم لے لو جو ابھی تک propose کیا ہو مگر ایسی غضب کی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے کہ اگر دس پندرہ دن تک میری یہی کیفیت رہی تو لڑھک جاؤں گا۔

ناہید۔ تمہیں شرم تو نہیں آتی کہ کہنے کو یوں میرا دم بھرتے ہو کہ آپا میری جان ہے اور آپا میرا ایمان ہے مگر آج تک میرے ہاں نہ لے آئے کہ میں بھی دیکھ لیتی۔ لوگوں سے سُنتی رہی کہ ثقو اور لُوسی یہاں گئے، وہاں گئے، دس دفعہ ناچے، بیس دفعہ سینما گئے مگر مجھ سے پردہ ہی رہا۔ یہاں لے آتے تو میں کیا اسے کاٹ کھاتی؟

ثاقب۔ سچ پوچھو تو تمہاری ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرتا رہا۔

ناہید۔ جھوٹا کہیں کا! اچھا آج لنچ پر اسے لاؤ۔ مگر دیر نہ کرنا۔ اور بھئی شادی کے متعلق تمہیں قطعی آزادی ہے۔ میں بیچ میں دخل دینے والی کون۔ تمہاری پسند سب سے مقدم ہے۔

ثاقب۔ ارے لو گھڑی کمرے میں چھوڑ آیا۔ کیا وقت ہے؟

ناہید۔ (گھڑی دیکھ کر) دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔

ثاقب۔ (جلدی سے اُٹھ کر) مجھے تو دس بجے لوسی کے ہوٹل جانا تھا۔

ناہید۔ تو کیا ہوا پندرہ منٹ دیر تو کوئی بات نہیں اور وہ کیا گیارہ بجے سے پہلے طیار ہوگی۔

ثاقب۔ یہ نہ کہو! بلا کی پھرتیلی ہے۔

ناہید۔ اچھا ٹھیک پونے ایک بجے پہنچ جانا۔ میں پانچ منٹ بھی انتظار نہ کروں گی۔

ثاقب۔ ضرور پونے ایک بجے ہم دونوں آنکلیں گے بلکہ کہو تو پہلے ہی آجائیں۔ یہاں مزے سے باتیں کریں گے۔

ناہید۔ ضرور پہلے آجاؤ۔ میں تو خود باہر جا رہی ہوں بمشکل ساڑھے بارہ گھر واپس آؤں گی اور ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گئی کہ سیالکوٹ سے وہ جو ہماری پھوپھی زاد بہن ہیں وہ بھی آرہی ہیں اور تمہارا ٹینس کا دیوانہ مسٹر ملک بھی آرہا ہے۔

ثاقب۔ کون پھوپھی زاد بہن: کیا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟

ناہید۔ تم کہاں سے دیکھتے۔ والد مرحوم کی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی نعیمہ ہے۔ کالج سے ابھی نکلی ہے۔ شاید ولایت کی بھی سیر کر آئی ہے۔

ثاقب۔ کیسی ہیں: یعنی شلوار پوش مولوی ہیں کہ کچھ اس زمانے کی بھی ہوا لگی ہے؟

ناہید۔ دو سال ہوئے دیکھا تھا، سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل بھی کچھ خاص طور پر جاذب نہ تھی۔ خدا جانے ان دو سال میں کیا تغیر ہوا! اور تمہیں اس سے کیا؛ تم ہو گئے لُوسی ہو گی گویا باقی دُنیا نہ ہونے کے برابر ہو گی۔

ثاقب۔ جھیڑو خانی میں بڑی اُستاد ہو۔ لو جا رہا ہوں۔ ہاں یہ تو بتا دو کہ دُنیا میں جو دو چار ہمارے رشتہ دار ہیں وہ سب کے سب پنجاب ہی میں کیوں نازل ہوئے؟

ناہید۔ بزرگوں کی غلطی مگر تم اس کمی کو پورا کر دو۔ بمبئی اور بمبئی سے پرے لندن تک رشتہ ڈھونڈو۔

(۲)

پونے ایک بجے کا وقت ہے۔ ناہید کا گول کمرہ خوبصورت سڈول سرو قد جسموں سے زندہ ہو رہا ہے۔ ایک ناہید کیا کم تھی کہ اس کے پہلو میں لُوسی!! چہروں پر تبسموں کی طغیانیاں، آنکھیں مصروف، دل مسرور کہ گی

سی رسیلی آواز سنائی دی۔

"آپا، آداب"

یہ نعیمہ تھی۔

ناہید بسم اللہ بسم اللہ کہتی جاتی ہے گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور پھر تعارف کراتی ہے "مس لوسی ہیمپٹن جی سے ملو۔ یہ مسٹر ملک ہیں۔" "یہ ثاقب ہے۔"

نعیمہ۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو۔ (لوسی سے)" "آپ ہیں ٹینس کے مہاتما" (مسٹر ملک سے)، اور ثاقب سے "آداب امی کی طرف سے دعا پیار۔"

ثاقب۔ اور تمہاری طرف سے۔

نعیمہ۔ آداب۔

ثاقب۔ ہو بڑی ہشیار مگر تمہارا نام بڑا ثقیل ہے۔

نعیمہ۔ مجھے تو سبھی نیمو کہتے ہیں۔ آپ بھی نعیمہ کہنے کا تکلف نہ کیجئے۔

ثاقب۔ اچھا مس نیمو۔

نیمو۔ جی بھائی سنئے!

ثاقب۔ (حاضر جوابی سے بے انتہا خوش ہو کر) ہمارے کنبے میں سبھی کی زبان گز بھر کی ہے۔

اس پر نیمو عجیب انداز سے منہ چڑاتے ہوئے سرخ پتلی نکیلی سی زبان یونہی باہر نکالتی ہے اور مذاق سے کہتی ہے۔

نیمو۔ تم سے تو چھوٹی ہی ہے۔

ثاقب۔ دو منٹ ملاقات کو نہیں ہوئے اور منہ بھی چڑانے لگیں۔ تیری گردن مروڑوں گا۔

اتنے میں ناہید بولی۔ "لوگو میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہے۔ چلو کھانا کھاؤ۔"

پہلے لوسی، پھر نیمو، ناہید، ملک اور ثاقب یکے بعد دیگرے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ثاقب نیمو کی سبک رفتاری کو غور سے دیکھ رہا ہے اور پھر دل ہی دل میں محسوس کرتا ہے کہ جس وقت سے نیمو کمرے میں داخل ہوئی اس وقت سے اب تک اس نے لوسی سے نہ کوئی بات کی نہ اس کی طرف دیکھا۔ اب دیکھتا سامنے لوسی کی طرف ہے مگر نگاہ نیمو کے دوپٹے پر الجھ کر رہ گئی۔ وہاں سے پھسلی تو لمبی چٹیا میں اٹکی۔

ناہید۔ لوسی تم وہاں بیٹھو۔ ثاقب میرے بائیں لوسی کے پاس بیٹھو۔ ملک میرے دائیں اور نیمو تم وہاں۔ علو ابھی آتا ہی ہوگا۔ بس بیٹھ جاؤ۔

دو خدمتگار کھانا لاتے ہیں کہ اتنے میں علو Hello Every body کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کو ہے کہ بائیں طرف نگاہ نیمو پر پڑی اور نیمو نے جھک کر کہا۔

"آداب، آقا میاں"

علو۔ (جلدی سے گلے لگا کر، پیشانی پر پیار کر کے) نیمو! بلا تو کتنی لمبی ہو گئی ہے! کہو امی اچھی ہیں؟

نیمو۔ جی ہاں دعا دیتی ہیں۔

کھانا شروع ہو گیا۔ ثاقب نے ایک آدھ بات لوسی سے کی اور پھر لوسی نے علو سے کہا۔

لوسی۔ آپ سے تو مل چکی تھی۔ آپ کی بیگم سے آج ملی ہوں۔ میری بڑی خوش قسمتی ہے۔

ثاقب۔ نیمو تم ریل سے آئی ہو؟

نیمو۔ موٹر سے۔

ثاقب۔ کتنی دیر لگی؟

نیمو۔ ۸۰ میل سے کچھ زیادہ ہے۔ سست چلاتی رہی۔ دو گھنٹے لگ گئے۔

ثاقب۔ کیا تم خود تمام رستہ چلاتی رہیں؟

نیمو۔ جی ہاں، موٹر چلتی رہی میں بیٹھی رہی۔ کہیں بھی اُتر کر دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ثاقب۔ اگر تم تیز چلاؤ تو گھنٹے بھر میں کتنے میل کر لیتی ہو؟

نیمو۔ پینتالیس بھی۔ اڑتالیس بھی۔ سڑک پر منحصر ہے۔

ثاقب۔ کیا کار ہے تمہاری؟

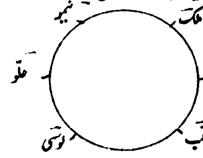
نیمو۔ آج تو بیوک (Buick) لائی ہوں مگر عام طور پر فورڈ (Ford) ہی استعمال کرتی ہوں۔

ثاقب۔ سنا لوسی تم نے؟ یہ سلپ آف اے گرل ساٹھ پینسٹھ میل کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے اور تم لوگ مجھے کہتے ہو کہ چالیس سے زیادہ نہ چلاؤ۔

لوسی۔ نیمو تم سے ڈرائیور بھی تو اچھی ہوگی۔ تم چلاتے کدھر ہو دیکھتے کدھر ہو؟

علو۔ لوسی تم پاس ہو تو نگاہ کا بھٹکنا معمولی بات ہے۔

اس پر خوب قہقہہ ہوا اور بات کہیں اور نکل گئی۔ مگر ثاقب کی نگاہ دوپٹہ قمیص سے نہ پھسلی۔ اس نے محسوس بھی کیا کہ دائیں ہاتھ بہن کی طرف اور بائیں ہاتھ لوسی کی طرف اس نے کم توجہ کی مگر اس وقت اسے یہ غور کرنے کا موقع نہ ملا کہ کھانے کی میز جب گول ہو اور نشست یوں ہو کہ نیمو تقریباً سامنے ہو



تو یہ بے توجہی خاص جرم نہ تھا۔ انسانوں میں دل نگاہ کا غلام ہے آنکھ اُٹھتی تو نیمو کی جانب، جسم جھکتا تو سامنے کی طرف، دل بچارا کیا کرتا؟ بڑھا، جھکا، تڑپا۔

(۳)

لنچ ختم ہونے پر کھانے کے کمرے سے پہلے خواتین اور پھر سگرٹوں سے سلگتے ہوئے تین نوجوان گول کمرے میں داخل ہوئے۔

علو۔ آؤ بھئی کچھ کھیلیں!

ثاقب۔ جی نہیں۔ ہم تو dance (رقص) کرنا چاہتے ہیں، ہیں نا لوسی! ذرا گراموفون تو منگواؤ، ناہید!

ناہید۔ گراموفون تو آج ہی مرمت کے لئے دُکان پر بھجوائی ہے۔

ثاقب۔ بڑی پھوہڑ ہو ناہید!

نیمو۔ تو بھائی ضرور لوسی سے dance کیجئے۔

ثاقب۔ موسیقی کے بغیر تو پاگل ناچتے ہیں۔

نیمو۔ آپ یہ قالین اور میز تو ہٹا دیئے۔

(یہ کہتی ہے اور کمرے کے کونے میں جو شاندار پیانو رکھا تھا اُسے بجانا شروع کرتی ہے)

قالین میز وغیرہ سب ہٹ گئے۔ راگ بڑھتا گیا۔ لوسی کی نازک کمر میں ثاقب کا ہاتھ، خوبصورت waltz چار پاؤں کی گلکاریوں کا ممنون تھا۔

جونہی راگ ختم ہوا لوسی بے اختیار جا کر نیمو سے لپٹ گئی۔ "تھینک یو ڈارلنگ"۔ "بیوٹیفل ڈارلنگ" کہتی جاتی تھی اور پیار کرتی جاتی تھی۔ ثاقب بھی بے حد مسرور تھا مگر ناچ کے بعد جب اس نے لوسی اور نیمو کے چہرے پاس پاس

دیکھے تو اس کی آنکھوں سے گویا پردہ سا اُٹھ گیا۔ کہاں پاؤڈر اور کریم کی ایک خوشنما تعمیر یعنی لُوسی کا چہرہ اور کہاں ایک قدرتی گلاب مگر ساتھ ہی اس کے دل میں لوسی کی عزت بے انتہا بڑھ گئی کہ کس گرمجوشی اور دلی خلوص سے اُس نے نیمو کا شکریہ ادا کیا۔ ثاقب کو یہ غور کرنے کا موقع نہ تھا کہ یہ اٹل قانونِ فطرت ہے کہ محبت جب جاتی ہے تو عزت ہی اس کی جانشین ہوتی ہے چنانچہ اس چھوٹے سے ڈراما کے بعد پہلا فقرہ جو اس نے لوسی سے کہا وہ بجائے معمولی بے تکلفی کے ادب و احترام کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ لوسی کا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ مجھے بجائے "لُوسی، یُو فُول" کہنے کے اس نے "لوسی ڈیر" کیوں کہا۔ نیک نہاد تھی تجربہ کار نہ تھی بھانپ نہ سکی کہ لُوسی کا پتنگ کٹ چکا۔

ناچ کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ لُوسی نے ثاقب سے کہا "چلو مجھے پہنچا آؤ"۔

ثاقب۔ تو کیا تم یہاں Tennis (ٹینس) نہ کھیلو گی؟

لوسی۔ بڑے شوق سے کھیلتی مگر کچھ ضروری کام ہے۔

ثاقب نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور "ابھی آتا ہوں" کہہ کر لُوسی کے ساتھ چل دیا۔

(۴)

اسی شام ٹھیک آٹھ بجے نیمو کے کمرے کے باہر ثاقب کھانے کا لباس پہنے ہوئے دروازے کو انگلیوں سے کھٹکھٹا رہا ہے۔ اندر سے نیمو آواز دیتی ہے "کون ہیں؟"

ثاقب۔ میں ہوں نیمو۔

نیمو۔ (اندر سے) کہئے خیر تو ہے؟

ثاقب۔ کیا تم سو رہی ہو نو بجنے والے ہیں، کیا کھانے پر نہ آؤ گی؟

نیمو۔ (اندر سے) لو نہ دس۔ ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔

ثاقب۔ واللہ تمہاری گھڑی غلط ہے۔ جلدی کرو میں تمہاری راہ تک رہا ہوں۔

نیمو۔ (اندر سے) اچھا ابھی آئی۔

اور تھوڑی دیر کے بعد نکل آتی ہے۔

ثاقب۔ ماشاء اللہ ساڑھی باندھنی بھی آتی ہے۔

نیمو (اضطراب سے) کیا سچ مچ میری گھڑی غلط ہے۔

ثاقب۔ یہ تو محض میرا بہانہ تھا۔ ابھی تو کھانے میں بہت دیر ہے۔ چلو تھوڑی دیر ہوا کھا آئیں۔

نیمو۔ بڑے حضرت ہو۔ مجھے واقعی یقین ہو چلا تھا کہ کہیں میری گھڑی غلط نہ ہو گئی ہو۔

ثاقب۔ اچھا معاف کر دو۔ مگر چلو ضرور۔

نیمو۔ جو آپ کی خوشی۔

چلتے چلتے ایک دلفریب مقام پر موٹر روک لی گئی۔ تنہائی تھی۔ تاریکی نہ تھی۔

ثاقب۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اس خوبصورت منظر کا لُطف اُٹھاؤ گی یا کچھ چلو پھرو گی بھی۔

نیمو۔ جی ہاں۔ ضرور چلئے۔ بیٹھے بیٹھے کیا کریں گے۔

دونوں خراماں خراماں پہلو بہ پہلو اِدھر اُدھر گھومتے ہیں ثاقب ہمہ تن تشویش ہے اور نیمو گویا قطعی بے خبر۔ سطحی باتوں کا سلسلہ جاری ہو کر رُک رُک جاتا ہے "ہوا کس قدر پُرلطف ہے" "یہ مدھم سی روشنی رُوح افزا ہے"۔ اس سکوت میں زندگی کے نئے معنی ہیں"۔

آخر ثاقب جی کڑا کر کے نیمو کے سامنے کو ہو کر کھڑا ہو

جاتا ہے۔ نیمو بھی جھجک کر رُک جاتی ہے۔

ثاقب۔ (لڑکھڑاتی زبان سے) یہ کہنا فضول ہے کہ تم کامیاب ڈاکو ہو۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ موقع دو کہ زندگی بھر کوشش محنت، محبت تمہاری نذر کرتا رہوں۔

نیمو۔ تو کیا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟

ثاقب۔ اگر تم قبول کرو۔

نیمو۔ (مسکرا کر) میں سمجھی کہ آپ شاید کہیں اور سوال کرنے کی مشق کر رہے ہیں اور ابھی مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا اظہارِ عشق کا میں اچھا ایکٹر ہوں۔

ثاقب۔ (اسی لڑکھڑاتے لہجہ میں) نیمو! نیمو!! خدا کے لئے میری زندگی کے پاکیزہ ترین لمحہ کو یوں فقرے بازی کی خاک میں نہ ملاؤ۔ کیا تمہیں اصل اور نقل میں فرق کرنے کی تمیز نہیں؟

نیمو۔ انداز سے تو سچے معلوم ہوتے ہو مگر کسی کے دل کا کیا پتہ؟

ثاقب۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟

نیمو۔ میرا دل بعض دفعہ یہ کہتا ہے کہ Love (محبت) سے زیادہ ذلیل حرکت دُنیا میں کوئی نہیں۔ جسے دیکھو Love کا شکار ہے۔ میں Love کا شکار رہنا پسند نہیں کرتی۔ اپنے دل و دماغ پر میں خود ہی مسلط رہنا چاہتی ہوں۔

ثاقب۔ تم بے انتہا پیاری ہو۔

نیمو۔ یہ کیا کوئی بڑی یا انوکھی بات ہے، قد ہو، شکل ہو، شگفتگی ہو، لباس ہو تو جو کوئی بھی ہو پیاری معلوم ہوگی۔

ثاقب۔ تم یہ سب کچھ رکھتی ہو اور اس سے بھی بہت کچھ زیادہ۔

نیمو۔ وہ کیا؟

ثاقب۔ اکثر حسین صرف حسین ہی ہوتے ہیں۔ تم حسن میں مغرور ہو کر بھی حسن پر حکمران ہو۔ حسن تمہارے کہنے میں ہے، تم اس سے بالاتر ہو۔

نیمو۔ یونہی باتیں ملاتے ہو۔ چلو گھر چلیں۔

(۵)

اسی رات کھانے کے بعد اپنی کوٹھی واپس جانے سے پہلے ثاقب اپنی ہمشیرہ ناہید کے کمرے میں دروازے بند کر کے یوں گفتگو شروع کرتا ہے۔

ثاقب۔ نیدو۔ تمہیں کچھ مروجہ تاریخ سے بھی مس ہے؟

ناہید۔ اخبار پڑھتی ہوں، کبھی کبھی ریڈیو کی خبریں بھی سُن لیتی ہوں۔

ثاقب۔ آج کی تازہ ترین خبر یہ ہے کہ تمہارے بھائی ثقو نے شادی کا سوال کر دیا اور اسے ٹکا سا جواب مل گیا۔

ناہید یہ سُن کر تھرّا سی جاتی ہے۔ اور پھر نہایت اضطراب سے کہتی ہے۔

ناہید۔ لنچ کے بعد جب تم لوسی کو پہنچانے گئے تو اس وقت تم نے اس سے سوال کیا ہوگا؟ کیا کہہ کر اس نے انکار کیا؟

ثاقب۔ واللہ بے انتہا کوڑ مغز ہو۔ لوسی بیچاری کا کیا تذکرہ تھا۔ یہ قصہ تمہاری اس بلائے جان نیمو کا ہے۔ کھانے سے پہلے اسے موٹر میں لے گیا۔ نہر کے کنارے سوال کیا اور اُس نے مجھے مذاق مذاق میں جتلا دیا کہ میں نہایت احمق ہوں۔

ناہید۔ واللہ بڑے فرمائشی گدھے ہو۔ ثقو تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری ایک دن کی ملاقات، میری وہ مہمان۔

ہم دونوں کو وہ کس قدر کمینہ خیال کرتی ہوگی۔ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ مسلمان خاتونیں قطعی آزاد ہوکر بھی شعائرِ اسلام سے خالی نہیں۔ میں صبح اسے کیسے مُنہ دکھاؤں گی؟

ثاقب۔ غلطی ہوگئی سو ہوگئی اور تم منہ دکھاؤ یا نہ دکھاؤ میں صبح ناشتہ کے لئے یہاں موجود ہوں گا اور اگر تم نہ کہوگی تو میں کہہ دوں گا کہ نیمو ہمیں سیالکوٹ اپنے گھر لے چلے۔ شام کو واپس آجائیں گے۔ نیمو سے تم نے میری شادی نہ کرائی تو

. . . . . .

ناہید۔ (بات کاٹ کر) اب تو تم جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔

ثاقب۔ رات بھر مجھے نیند تھوڑی ہی آئے گی۔

ناہید۔ خدا کے لئے اب جاؤ۔ غلط طریقہ خود اختیار کرتے ہو الزام بہن کے سر تھوپتے ہو۔ شادی کرنی ہے تو اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کرو۔ نہ کہ یہ کہو "نیمو تم پر مرتا ہوں اس لئے مجھ سے شادی کرلو"

ثاقب۔ محبت کو تو نیمو ایک ذلیل حرکت قرار دیتی ہے۔

ناہید۔ تمہاری محبت واقعی ایک ذلیل حرکت ہی ہے۔

ثاقب۔ نیدو ڈارلنگ جس طرح ہو میری مدد کرو۔ دراصل قصور تمہارا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں کبھی نہ بتایا کہ مسلمانوں میں بھی ایسی لڑکیاں ہیں جو کانی نہیں ہیں۔

ناہید۔ یہ تو میں تب کہتی جب مجھے یقین ہوتا کہ مسلمان لڑکے کانے نہیں۔ میں تو تمہارے سمیت جسے دیکھتی ہوں کانا ہی پاتی ہوں۔ کوئی روپیہ کے پیچھے مرتا ہے تو کوئی فیشن کے پیچھے۔ ایک بھی نہیں جو شرافت اور مسرت کا پرکھیا ہو۔

ثاقب۔ اپنے وعظ اب رہنے دو اور کوئی ترکیب سوچو کہ نیمو میری بن جائے۔

ناہید۔ شرم تو نہیں آتی۔ اپنا کام مجھ پر ڈالتے ہو۔ اپنے آپ کو اس قابل کیوں ثابت نہیں کرتے کہ وہ خوشی سے تمہیں قبول کرے۔

ثاقب۔ یہ تو کروں گا ہی مگر تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔

(۶)

دوسری صبح نیمو، ناہید اور ثاقب موٹر میں سیالکوٹ روانہ ہوئے۔ ثاقب رات بھر نہ سویا تھا۔ موٹر کوئی آٹھ دس میل لاہور سے نکلی ہوگی کہ سو گیا۔ نیمو موٹر چلا رہی تھی اور اس کا بایاں کندھا گویا ثاقب کے سر کے لئے تکیہ بن گیا۔ ناہید چپکی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اتنے میں دونوں حیران ہوگئیں کہ ثاقب سوتے سوتے بہت ہی رساں رساں کوئی نام لے رہا ہے۔ یہ نام

نیمو

تھا۔ دفعتہً نیمو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ فتح یابی کی وہ مسرت جو شباب کا خاصہ ہے اس کے چہرے پر چمکی مگر باوجود بوجھ محسوس کرنے کے اس نے کندھے کو پرے نہ کیا۔ جو کام ثاقب جاگتے ہیں نہ کرسکتا تھا وہ اس نے گہری نیند کی حالت میں کرلیا۔

سیالکوٹ پہنچ کر نیمو کی والدہ کو ناہید اور ثاقب نے آداب کہا۔

بیگم۔ (ناہید اور ثاقب کو مخاطب کرکے) بسم اللہ۔ بہت ہی اچھا کیا کہ تم دونوں آگئے۔ آنکھیں ترس گئی تھیں۔

ثاقب۔ پھوپھی اماں، نیدو کی باتوں میں نہ آئیے۔ یہ تو میں انہیں لایا ہوں۔ یہ گھر سے کب نکلتی ہیں۔

ناہید۔ جی ہاں پھوپھی اماں! یہ بات تو ثاقب ٹھیک کہتا ہے۔
ثاقب۔ پھوپھی اماں۔ مجھے تو آپ کی اجازت ہے نا کہ جب چاہوں
آجاؤں۔ میں کوئی شیڈ ڈ کی طرح کا قیدی تھوڑا ہی ہوں۔
بیگم۔ بیٹا جب چاہو آؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔
اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور نیمو نے آکر
کہا کہ کھانا تیار ہے۔ سب کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے۔
بیگم کھانے کے کمرے میں سب کے ساتھ آئیں اور یہ کہہ کر
کہ "بیٹا مجھے معاف کرو، تم بسم اللہ کرو" چلی گئیں۔ گھر کا چپہ چپہ
کونا کونا گویا کہہ رہا تھا کہ اس گھر میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن
کا دل بے چین نہیں۔ کھانے کے کمرے میں قیمتی چیزیں نہ تھیں
مگر ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی اپنی جگہ پر گویا چمک رہی تھی۔
دیواروں پر چند فارسی قطعات تھے، میز پر دو نہیں خوبصورت
گلدان تھے۔ کمرہ گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ گو گھر کا امیر
ہوں مگر دولت کی نمائش سے بالاتر ہوں۔ مگر ثاقب نے کمرے کو
نہ دیکھا۔ نیمو میں محو رہا۔

(۷)

ثاقب نے اپنے جس دوست سے اس تمام ماجرے کا ذکر
کیا وہ دوست اب اس سچی سرگزشت کو جھوٹ کے لباس میں پیش
کر رہا ہے۔ جب ثاقب بات ختم کر چکا تو دوست نے متعجب
ہو کر پوچھا کہ آخر اس تمام واردات میں انوکھی بات کیا ہے؟
ثاقب۔ تم افسانہ نویسوں کے اس مرض کا کوئی علاج نہیں کہ زندگی
میں، جو ایک معمولی چیز ہے، غیر معمولی جذبہ کی تلاش میں سرگرداں
رہتے ہو تمہاری نگاہیں نہیں ہیں کہ بھولے بھالے سیدھے سادے
لفظوں کے معنوں کو دیکھ سکو۔ یا پہچان سکو۔ کوشش کرو اور سمجھو

آج پورے چھ مہینے ہوئے کہ نیمو کو پہلی دفعہ دیکھا۔ نہیں یہ غلط
ہے۔ پہلے اس کی آواز سنی اور پھر اسے دیکھا۔ اس کا وہ ایک لفظ
"آداب" اور ناہید کی خیر مقدم کی "بسم اللہ" گویا دو جادو چل گئے۔
قلب کی تاریک گہرائیوں کے اندر بجلی سی چمکی اور میں جو اکفر الکفار
تھا مسلمان ہو گیا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر کسی سے شادی کی
تو میرے بچوں کو دنیا بھر کی دولت نصیب ہو گی مگر انہیں کوئی
اس محبت سے "بسم اللہ" نہ کہے گا جس محبت سے ناہید نے
نیمو کو بسم اللہ کہی۔ بچوں کو بسم اللہ کی دولت سے محروم رکھنا مجھے
سب سے بڑا جرم معلوم ہوتا تھا۔ خود بخود میرا دل یہ کہنے لگا کہ
جن بچوں کی ماں مسلمان نہیں وہ نہ "آداب" کہہ سکتے ہیں نہ "بسم اللہ"
سن سکتے ہیں۔ اندر ہی اندر کشمکش رہی، سخت اور تلخ کشمکش رہی۔
کہ پرانی اوہام پرستی کا شکار نہ ہوں مگر وہ سحر جو انسانی خون میں ہے
عقل سے زیر نہ ہوا۔ ماں باپ کے مسلمان خون نے بسم اللہ کو
بسم اللہ کہی اور فیشن سے نہ دبایا پر نہ دبا۔ لوگ عورت کے پیچھے
عیسائی ہو جاتے ہیں۔ میں دو دلکش جملوں کی صداؤں کے لئے
مسلمان رہ گیا۔
دوست۔ جب نیمو نے اپنے کندھے سے تمہارا سر نہ ہٹایا اور اس
کے بعد اس نے ہمیشہ تم سے خاص محبت کا سلوک کیا تو
اب تک تمہاری نسبت کا اعلان کیوں نہیں ہوا؟
ثاقب۔ پھر وہی افسانہ نویسوں والے استفسار۔ خدا جانے
آپ حضرات یہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ زندگی اصلی عملی
زندگی، افسانوں کی قیود سے آزاد ہے۔ بندۂ خدا اتنا تو
سوچو کہ نیمو مجھ سے کیوں کہنے لگی کہ اس نے میرا سر جان بوجھ
کر کندھے سے لگا رہنے دیا۔ ناہید اپنے کمینہ پن کی حرکت

کیوں کرتی کہ مجھے نیمو کے خلاف ایک Un fair advantage دیتی۔ یہ واقعہ ہے کہ میں خوش نصیب ہو کر
بھی اپنی بیدار ہوئی بخت سے بے خبر رہا۔ نیند میں میری قسمت
جاگی ۔ مجھے جاگ کر بھی اس کا پتہ نہ چلا ۔ مگر اب جو تم
پوچھتے ہو تو جو واقعہ کل پیش آیا وہ تمہیں بتا دیتا ہوں
پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیوں ہماری نسبت نہیں ہوگی
مگر شادی جلد ہو جائے گی۔

میں اور نیمو کچھ عرصے سے چند تاریخی واقعات کا مل کر
مطالعہ کر رہے ہیں ۔ مل کر کام کرنے میں جو روحانی یگانگی پیدا
ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک حسین دُنیا ہے ۔ کل اتفاق
سے ہم نور جہاں کے متعلق کچھ مطالعہ کر رہے تھے ۔ نیمو کی
اور میری یہ گفتگو ہوئی ۔

نیمو۔ مؤرخ کس قدر احمق ہیں ۔ نور جہاں کا ذکر ہمیشہ یوں ختم
کرتے ہیں کہ ملکہ کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے واقع
ہے ۔ باغ ویران ہے، کتبہ گم ہے ۔

ثاقب۔ اور بیچارے کیا لکھیں ؟ یہ واقعہ ہے ۔

نیمو۔ اس واقعہ کو نور جہاں سے کیا تعلق ؟ یہ تو ہماری دُنیا کی
کجی کا ثبوت ہے، ورنہ نور جہاں کی مٹی نور جہاں نہیں ۔
نور جہاں، ایک طاقت تھی، ایک عروج تھا۔ وہ طاقت، وہ
عروج زمانہ کے لئے ہمیشہ ایک روشن مثال ہے ۔ انسان
کے بڑھاپے یا موت کا ذکر فضول ہے ۔ دیکھنا صرف یہ
ہوتا ہے کہ جب وہ کچھ کر سکتے ہوں تو انہوں نے کیا کیا ؟

ثاقب ۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے مگر نیمو تم بھی تو انسان ہو اور
کچھ نہ کچھ کر سکتی ہو۔ بتاؤ تم نے کیا کیا ؟

نیمو۔ مجھے تو جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکی ۔

ثاقب ۔ کب اور کیسے ؟

نیمو۔ کیا ناہید نے تمہیں نہیں بتایا ؟

ثاقب ۔ حاشا و کلا ۔ اس نے مجھے ہرگز کچھ نہیں بتایا ۔

نیمو۔ کیا لاجواب ہستی ہے ۔ اگر میں نیمو نہ ہوتی تو ناہید ہونے
کی آرزو کرتی ۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ تمہارے
اس کدو سر نے میرے کندھے کو تکیہ کر دیا مگر کسی خیال سے
میں نے اسے نہ ہٹایا ۔ نور جہاں نے تو صرف کبوتر اڑائے
اور وہ سلیم کے پسند آ گئی ۔ ہم بوجھ نہ ہٹائیں تو بھی ہماری
قدر نہیں ۔

اس فقرے کے بعد میں نے لپٹ کر پیار کرنے
کی کوشش کی مگر اسے میرا فقرہ یاد تھا ۔ کہنے
لگی :-

"گردن حاضر ہے ۔ مروڑ لیجئے"

"فلک پیما"

رعنائیاں

(۱)

کس جلوۂ پُر کیف سے مخمُور ہے دُنیا؛
ہر سمت نئے حسُن سے معمُور ہے دُنیا!

بجلی کے تڑپتے ہوئے کوندوں کی لپک میں
برسات کی بھیگی ہوئی راتوں کی جوانی!
مہتاب سے برسی ہوئی کرنوں کی چمک میں
ہنستے ہوئے دریا کا چھلکتا ہوُا پانی!
شبنم کے کھلائے ہوئے پھُولوں کی مہک میں
بیتاب پپیہوں کی جگر دوز کہانی!
چھٹکے ہوئے تاروں کی دل افروز جھلک میں
جنگل سے گزرتی ہوئی ندیوں کی روانی!

اے بے خبرِ حسُن تجھے یہ بھی خبر ہے؛
ہر گام پہ اِک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے!

(۲)

کس جلوۂ پُر کیف سے مخمُور ہے دُنیا؛
ہر سمت نئے حسُن سے معمُور ہے دُنیا!

سرسبز پہاڑوں میں چھلکتے ہوئے جھرنے!
وادی میں مچلتے ہوئے چشموں کا ترنم!

شاما کی دل آویز غزل نُور کے تڑکے!
صحرا کی خموشی میں جمالِ مہ و انجم!
کُہرے میں اُبھرتے ہوئے سُورج کے کرشمے!
مہتاب کے جلووں میں سمندر کا تلاطم!
رنگین دھندلکوں میں ابابیل کے نغمے!
ٹھہری ہوئی جھیلوں میں ستاروں کا تبسّم!

اے بے خبرِ حُسن تجھے یہ بھی خبر ہے؟
ہر گام پہ اِک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے؟

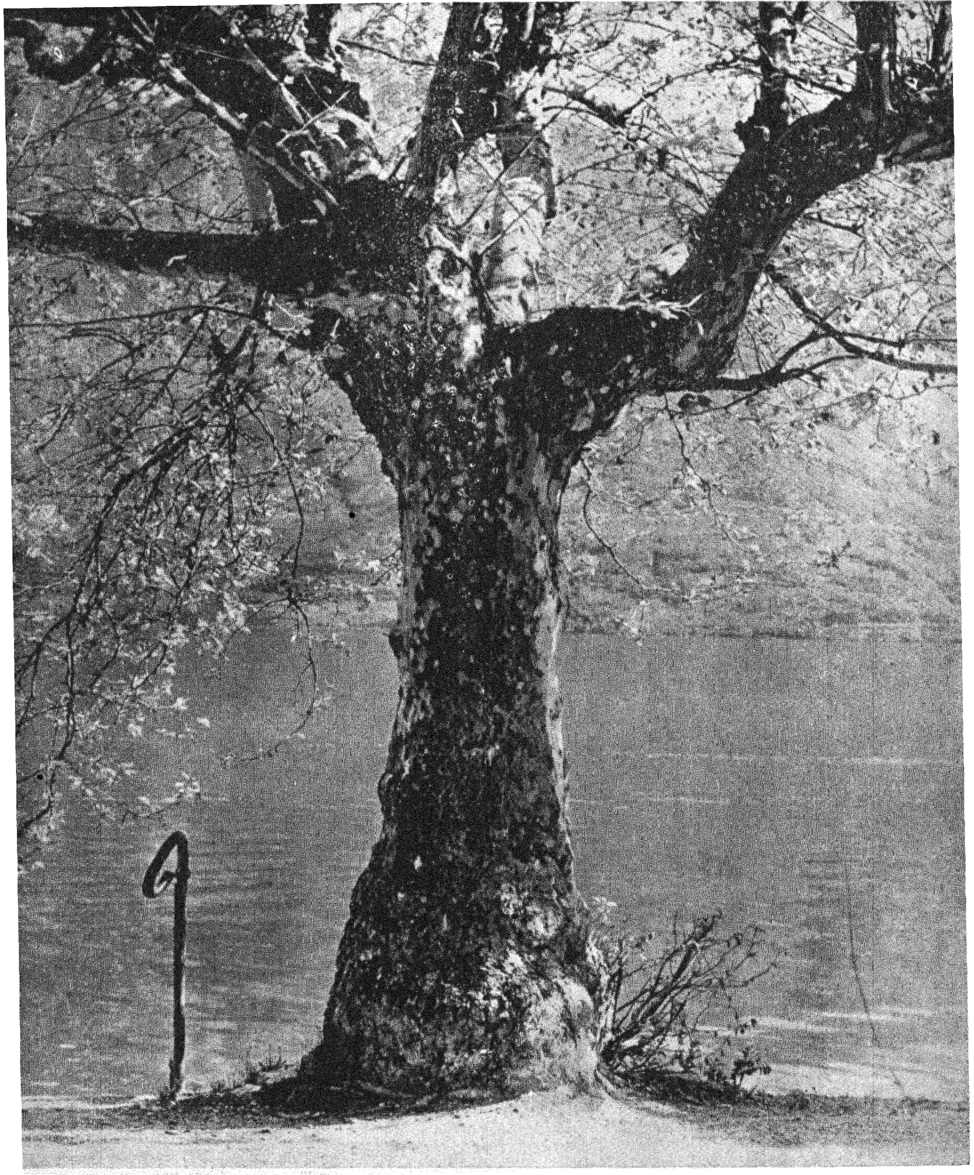
(۳)

کِس جلوۂ پُرکیف سے مخمُور ہے دُنیا؛
ہر سمت نئے حُسن سے معمُور ہے دُنیا!

ساون کی مہکتی ہوئی گلریز ہوا میں
گُلشن کی لچکتی ہوئی شاخوں کے ترانے!
میدان کی سہمی ہوئی خاموش فضا میں
فرقت کی ستائی ہوئی کویل کے فسانے!
مہتاب کے پُر نور تبسّم کی ضیا میں
تالاب میں پگھلی ہوئی چاندی کے خزانے!
راتوں کو وہ بوچھار کی مخمور صدا میں
بوندوں سے ٹپکتے ہوئے کچھ گیت سہانے!

اے بے خبرِ حُسن! تجھے یہ بھی خبر ہے؛
ہر گام پہ اِک منظرِ نَو پیشِ نظر ہے!

ذوقی



حسن فطرت



مصر کی ایک بیوپار گاڑی

عہد

جمیل نے اپنے دل میں عہد کرلیا کہ اب میں 'ان' کے ہاں نہ جاؤں گا۔ سارا راستہ وہ اپنے آپ سے یہی کہتا آیا کہ "اب تو کبھی 'ان' کے ہاں نہ جاؤں گا۔ آخر فائدہ؟ مجھے وہاں جانے سے حاصل ہی کیا ہوتا ہے؟ اپنے آپ سے نفرت! ہوش و حواس میرے صحیح ہیں، تیس سال کی میری عمر ہے، لوگ مجھے پختہ رائے سمجھتے ہیں۔ روز سنتا ہوں "شیخ صاحب آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں یہ سینما بہت دیکھتا ہے، گھر بیوی بچے ہیں مگر جب دیکھو سینما کا طواف ہی کرتا نظر آتا ہے" یا "شیخ صاحب کیا بتاؤں آج کل کے بچوں سے خدا بچائے، میرے لڑکے کا پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ کیا کروں؟ اسے سکول سے اُٹھوا لوں؟ کس کام میں لگاؤں؟" یا "شیخ صاحب آپ کی ملاقات اتنی وسیع ہے، آپ ہی کوئی رشتہ بتائیے، میری لڑکی اب جوان ہوگئی ہے، آج کل کا زمانہ بُرا ہے، میں چاہتا ہوں، جتنی جلدی فارغ ہو جاؤں بہتر ہے۔" یا کسی سے فیصلہ کرانا ہو تو بھی مجھ سے! جیسے دفتر میں اور کوئی معتبر آدمی ہے ہی نہیں! اور معلوم نہیں کہ شیخ صاحب یوں بندھے ہوئے، مجبور، 'وہاں' جانے سے باز نہیں آتے، مگر اب تو وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔ اب تو پکا عہد کرتا ہوں۔ آخر حاصل؟ مجھے مل ہی کیا جائیگا؟ بیوی وہ میری ہو نہیں سکتی"۔ جھنجلا کے "مگر کیوں نہیں ہو سکتی؟ آخر اس کا خاوند کتنے سال سے ولایت میں بیٹھا رہا ہے؟ بدمعاش وہاں عیاشیاں کرتا پھرتا ہے۔ واپس نہیں آتا؟ ایسی بیوی اور پھر نہ آئے! ہزار ہا روپے برباد کر رہا ہے۔ مگر وہ تو باپ ہی اس کا بے وقوف ہے کہ خرچ بھیجتا ہی چلا جاتا ہے۔ ساری دُنیا کو معلوم ہے کہ وہ وہاں کیا کچھ کر رہا ہے۔ پانچ سال ہونے کو ہیں، خاک پڑھتا ہے! اور ایک ہفتہ کی بیاہتا! جس نے ایک دن بھی میکے سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اور یوں اس کا نکاح ہو چکا ہے بس نکاح اور میاں رخصت۔ شاید دوسرے دن ہی کہ ہفتہ بعد۔ اور والدین دونوں طرف خوش کہ لڑکا ذمہ داری محسوس کرے گا۔ اب وہاں سے میم تو نہیں لائے گا۔ جیسے میم لانے کی اسے ضرورت ہے! وہاں میمیں تھوڑی ہیں۔ اوّل تو یہاں واپس ہی آنے کی کیا جلدی ہے؛ روپیہ اس کے پاس کافی ہے، باپ اور بھیجنے کو ہر وقت تیار ہے۔ مرضی کا وہ مالک ہے، عیش وہ کرتا ہے وہ کیوں واپس آئے؟ اُس کی بیوی؟ ہونہہ! اس کی بیوی کس حیثیت سے؟ جس نے بیوی کو کبھی آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا تھا! وہ اور ایسی بیوی! وہ اور نزہت! . . . .

جمیل سارا راستہ انہیں خیالات میں ڈوبا رہا۔ نزہت اور اس کی بے نیازی! نزہت اور اس کے کوٹھے! نزہت اور اس کا شباب! ان خیالات میں مبہوت، اپنے آپ سے اس کا مقابلہ کرتا چلا آ رہا تھا۔ کہاں میں جو ازل سے بوڑھا ہوں جس نے فیشن کی جھلک تک نہ دیکھی ہو اور کہاں نزہت جو بی۔ اے میں پڑھ رہی ہو، جسے اس کے والدین اعلیٰ تعلیم اس لئے دلوا رہے ہوں کہ خاوند کے آنے تک وہ شائستہ اور لائق اور ہر طرح سے اس کی 'رفیقۂ حیات' بن سکے! کہاں یہ بانکپن، یہ بناؤ سنگار اور کہاں میں جسے دیکھ کے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ نہ اس نے کبھی مذاق کیا ہے اور نہ کوئی اور اس سے کوئی مذاق کرے جیسے ہر رشتہ دار مدبر اور با اثر گردانتے ہوئے ہر وقت کسی نہ کسی سفارش، یا کسی کسی

کام کی فرمائش ہی کرتا رہتا ہے، جسے بچے خضر سے بھی بوڑھا سمجھتے ہیں اور جسے معمر رشتہ دار اپنا ہم عمر تصور کر کے برادری کے ہر معاملہ میں شریک کر لیتے ہیں!! ایسے شخص کو سوائے متانت اور عقلمندی کے اور کس چیز کی جستجو کرنی چاہیئے!"

جمیل اسی طرح اپنے آپ سے چڑتا، جھنجھلاتا، نفرت کرتا، سارا راستہ افسردہ خیالات میں غرق اپنے مکان پر آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پگڑی اتار میز پر دے ماری، اچکن اتار کرسی کی پشت پر ڈال دی، آپ ایک آرام کرسی پر بیٹھ کے بوٹ کھول ایک طرف رکھ دیا اور ٹانگیں دراز کر کے پھر اپنی زندگی پر لعنت بھیجنے میں مصروف ہو گیا۔

اس کی عمر اب تیس سال کے قریب تھی، قدآور اور قوی ہیکل ہونے کے باعث وہ واقعی معتبر اور معزز معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ کی ساخت ہی جسم کی طرح مضبوطی اور پختگی کا پتہ دیتی تھی۔ آنکھیں متین اور بڑی بڑی تھیں، ماتھا کھلا ہوا، سر کے بال لمبے اور سیدھے ہونے کے باعث مانگ کے دونوں طرف خوب جمے رہتے تھے۔ داڑھی تو منڈی ہوئی تھی مگر خوش وضع اور مقطع مونچھیں اس کے چہرے کے وقار کو بڑھاتی تھیں۔ وہ سنجیدہ اور خاموش طبیعت کا مالک تھا۔ اس لئے کبھی کسی نے اس کے متعلق کسی جنسی دلچسپی کا شبہ تک بھی نہیں کیا تھا۔ رشتہ دار اور دوست حیران ضرور ہوتے کہ جمیل جو ہر طرح سے فارغ البال ہے، شادی کیوں نہیں کرتا، وہ کسی سرکاری دفتر میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا۔ دو سو روپیہ سے زیادہ تنخواہ پاتا تھا۔ والدین اس کے مر چکے تھے، ایک بہن تھی جو بیاہی ہوئی تھی۔ اکیلا تھا مگر پھر بھی کنوارا تھا۔

رشتہ داروں میں ایک ماموں کا گھر ہی ایسا تھا جہاں جمیل کا آنا جانا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ تھے ہی لاہور کے رہنے والے۔ یہ ماموں اب کافی سن رسیدہ تھے۔ ان کی عمر پینسٹھ سال کے قریب تھی۔ پولیس انسپکٹر ہوا کرتے تھے، اب انہیں اخبار بینی اور شطرنج کھیلنے کے علاوہ اور کوئی شوق نہ تھا البتہ اپنی سب سے چھوٹی لڑکی نزہت سے بہت محبت تھی۔ نزہت کی عمر اب تیئس سال کی تھی۔ پانچ سال ہوئے جب اس کا منگیتر اشرف ولایت جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اس کی والدہ نے جو رشتہ میں اشرف کی پھوپھی لگتی تھیں یہ فیصلہ کیا کہ کم از کم نزہت کا نکاح کر دینا چاہیئے۔ اشرف تو نہ مانتا تھا مگر اس کے والد نے کہا کہ تم ہمارا کہا نہ مانوگے تو ہم تمہیں ولایت نہ بھیجیں گے۔ نزہت کوئی غیر تو ہے ہی نہیں، اچھی، باتمیز لڑکی ہے، اس کے سوا اور کیا لوگے۔ چنانچہ ان کا نکاح ہو گیا۔

نزہت اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ انٹرنس پاس کئے اُسے دو سال ہو چکے تھے مگر اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی کیونکہ اس کی صحت کمزور تھی اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ اسے مکمل طور پر آرام کرنے دیا جائے۔ دو سال کے آرام سے اور گرمیوں میں کشمیر جانے سے اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی مگر اس کا جسم ابھی تک سڈول نہ تھا اور اس کے گال ابھی تک سرخ نہ ہونے پائے تھے۔ جب اس کا نکاح ہوا تو اسے بھی تقاضائے عمر کچھ عرصے کے لئے نئے نئے کپڑوں، زیورات اور چاؤ چاؤ سے خوشی ہوئی اور اسے معلوم ہوا جیسے اب دن رات کیفیت کے لحاظ سے بدل گئے ہیں اور ہر چیز میں ایک نئے معنی اور ہر بات میں کوئی نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ یہ حالت تین چار مہینے تک رہی۔ بعد میں بتدریج نامعلوم طور پر یہ نیا پن اور شوق کم ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ ہر چیز اپنی پہلی حالت پر آ گئی۔ کپڑے فقط کپڑے رہ گئے اور زیورات میں کوئی ندرت باقی نہ رہی۔ رنگدار دوپٹوں کا رنگ وہی رہا مگر وہ بھڑک جو تھوڑے عرصے کے لئے پیدا ہو گئی تھی، ہٹتی گئی۔ مگر یہ تبدیلی اس آہستگی سے ظہور میں آئی

کہ نزہت نے شعوری طور پر اسے محسوس نہ کیا۔ وہ گدگداہٹ جو چند مہینوں کے لئے اس کے دل میں اور وہ خمار جو اس کے خون میں سرایت کرتا معلوم ہوتا تھا رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ اس سے نزہت کو نہ کوئی حیرت ہوئی نہ ملال۔ اس کی طبیعت میں تجزیۂ نفس کرنے کی خواہش بہت کم تھی۔ ابھی اس کے لئے دن اور رات فقط روشنی اور تاریکی کے دو مظہر تھے اور کائنات اور انسان، مسائل حیات اور وارداتِ قلب جیسے تفکرات گویا دُنیا میں موجود ہی نہ تھے۔ صبح کا اُٹھنا، اور گھر کا انتظام، والد کی خبر گیری اور ان کی ضروریات کا پُورا کرنا ہی اس کے لئے کافی کام تھا اور رات کو جوانی کی بے فکر نیند۔

مگر آتی گرمیوں میں اسے کالج داخل ہونا پڑا۔ یہاں کی دُنیا ہی اَور تھی۔ نئے نئے مضامین تھے اور نئے لباس، نئی نئی لڑکیاں، نئے مشغلے، نیا ماحول! غرضکہ ایک نئی زندگی تھی۔ نزہت کی نشوونما اب صحیح معنوں میں شروع ہوئی۔ شاید اس دماغی آزادی نے اس کے تمام قویٰ پر اثر ڈالا ہو، کیونکہ نزہت کی صحت اور بھی بہتر ہو گئی۔ اور اب اس کے شباب کا آغاز ہوا۔ نزہت کا شباب خود اپنے لئے بہت پُرسکون اور مسرت انگیز تھا۔ اب اسے چلنے میں مزا آتا تھا۔ انگڑائی لینے میں اسے ایک نامعلوم سرور محسوس ہوتا تھا۔ کئی دفعہ تو وہ محض اپنے جسم کی حرکت ہی میں ایک عجیب خمار اور مستی محسوس کرتی۔ اس کا رنگ اب پورے نکھار پر تھا۔ اس زردی کا جو کسی زمانہ میں اس کے چہرے پر دیکھی جاتی تھی اب نشان تک نہ تھا، اس کے گال اب سنہری مائل گندمی تھے۔ مگر اس کے ہونٹ! اس کے ہونٹ قدرتی طور پر سُرخ تھے۔ اس کی طبیعت اس قدر پُرسکون تھی کہ اسے کالج کی زندگی اور دلچسپیاں بھی جوشیلا نہ بنا سکیں۔ کالج میں بھی وہ اُسی استغنا سے رہتی جس طرح گھر پر۔ کالج کے ہر شغل میں وہ حصّہ لیتی مگر ایسے اطمینان اور استغنا کے ساتھ کہ بعض سہیلیاں تو اسے بے حس ہی خیال کرتیں۔ مگر نزہت کو قدرت نے طبیعت ہی ایسی دی تھی کہ وہ ہر مشغلے اور ہر کھیل کو اسی سکون اور اطمینان سے دیکھتی جس سے وہ تمام جسمانی وظائف اور روزمرہ کے مشاغل کو۔

نزہت اگرچہ ان دنوں بیس ایک سال کی تھی مگر اس میں بچپن کی سی سادگی ابھی تک موجود تھی۔ کہنے کو اس کا نکاح ہو چکا تھا اور یوں بھی وہ کتابوں، اشعار اور گفتگو کے ذریعے سے دُنیا اور اس کے مسائل سے واقف ہو گئی مگر وہ طمانیت جو اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ جھلکتی رہتی اور وہ استغنا، جو اس کی ہر حرکت میں ظاہر ہوتا رہتا جمیل کے لئے بہت حوصلہ شکن تھا۔ جمیل اب تک اپنے دل میں یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ وہ اس سے چاہتا کیا ہے مگر اسے اس بات سے مایوسی ضرور ہوتی کہ خواہ وہ گھنٹوں اُن کے ہاں بیٹھا ہے، اس کے ابا سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہے، خواہ وہ شطرنج کی بازیوں پہ بازیاں کھیلتا رہے، نزہت کی جبیں پر یا نزہت کی آنکھوں میں کوئی ہلکا سا اثر بھی اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ سلام کرنے میں نہ کبھی وہ عجلت کرتی اور نہ کبھی دیر۔ نہ اس کی باتوں میں جھجک ہوتی نہ اشتیاق، نہ کبھی اُس نے جمیل کی ایک ایک ہفتہ کی غیر حاضری کی شکایت کی اور نہ کبھی وہ اس کے بار بار آنے سے اُکتاتی۔ بھائی جمیل ہمیشہ سے گھر آیا کرتے تھے۔ کبھی مہینہ میں ایک بار اور کبھی دو دو مہینہ کا ناغہ ہو جایا کرتا تھا اور کبھی ہفتہ میں دو بار بھی آ جایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ کبھی کبھی اس کے نکاح کے متعلق مذاق بھی کیا کرتے تھے، مگر اب دیر سے انہوں نے نکاح کا ذکر بھی نہیں کیا تھا، پھر نہ نکاح نے نزہت کی زندگی میں ذرہ بھر فرق ہی پیدا کیا تھا۔

شروع شروع میں جمیل کو نزہت میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔ مگر جب نزہت نے کلی کی طرح کھلنا شروع کیا جب اس کا بدن روز بروز گداز ہوتا گیا اور ہونٹوں کی سرخی بڑھتی گئی تو اس کی چال میں وہ لچک پیدا ہونی شروع ہوئی جس نے جمیل کی توجہ کو پہلے پہل اپنی طرف کھینچا۔ اب نزہت کو پھرتے دیکھ کر اس پر ایک موہوم سا بےچین کرنے والا اثر ہونے لگا، وہ سوچتا بھی کہ اس کی کیا وجہ ہے مگر اس کی فطرت ایسی باریک بین نہ تھی کہ یہ سمجھ سکے کہ وہ نزہت کے قرب سے کیوں گھبراجاتا ہے اور اسے نزہت کی طرف غور سے دیکھنے میں کیوں جھجک ہوتی ہے۔ اس لئے اگرچہ نزہت کے جسم کی لچک یوں اس کے دماغ پر مسلط ہوتی جارہی تھی، اس کے آنے جانے میں کوئی فرق نہ پڑا۔

وہ نزہت کے متعلق سوچتا بہت مگر چونکہ نزہت کا نکاح ہو چکا تھا، اس کے راست عقیدہ دماغ میں شبہ تک بھی نہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بےچینی کسی اور جذبہ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی میں جذباتی تجربات اور تاثرات کا بہت کم حصہ تھا اور چونکہ اس موہوم اضطراب میں لذت کی آمیزش بھی تھی وہ اس سے پریشان نہ ہوتا۔ مگر رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ فقط نزہت کی چال ہی نہیں، اس کے جسم کی ساخت ہی اس بےچینی کا باعث ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ نزہت اس اثر سے بالکل بےخبر ہے۔ نزہت کے کھڑا ہوتے ہی اس کا جسم لاشعوری طور پر ایسے بےپروا انداز قائم کرلیتا ہے کہ اس میں ایک قدرتی کشش پیدا ہو جاتی ہے، یہ شاید اس لئے بھی صحیح تھا کہ نزہت اپنے بناؤ سنگار میں کبھی زیادہ وقت نہ صرف کرتی۔ مگر اس کا شباب اس کے عضو عضو سے چھن چھن کر گھر کی فضا کو مخمور کرتا رہتا۔ اور جمیل تو خواہ نزہت کہیں ہو، اس کی موجودگی کو فوراً محسوس کرلیتا، اسے محسوس ہوتا کہ یہ کشش نہاں لہروں کے ذریعہ اس کے جسم پر اثر کرتی ہے۔

چنانچہ جمیل کی بےچینی اب اشتیاق میں تبدیل ہونا شروع ہوئی اور جب وہ ان کے ہاں جاتا تو نزہت کی موجودگی کا احساس اسے اس شدت سے ہونے لگتا کہ نہ وہ اسے دیکھے بغیر رہ سکتا اور نہ وہ اسے دیر تک دیکھ ہی سکتا۔ اس کی آنکھیں تجسس کناں، نزہت کی سمت اٹھتیں، مگر بعض دفعہ اس کے چہرہ تک اٹھائے بغیر ہی وہ انہیں لوٹانے پر مجبور ہو جاتا۔ نزہت کی چال بعض دفعہ اس کے لئے اس قدر اضطراب انگیز ہو جاتی کہ وہ قصداً اسے چلتے پھرتے نہ دیکھتا۔ مگر جب تک وہ وہاں بیٹھتا اس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان بپا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود شطرنج کا اچھا کھلاڑی ہونے کے وہ اپنے ماموں سے اکثر دو دو تین تین بازیاں ہار دیتا۔

اکثر جمیل اس الجھن کے باعث دو دو ہفتہ ان کے ہاں نہ جاتا۔ مگر آخر وہ اکیلا تھا، دوست یار اکثر آتے اور وہ ان کے ہاں جاتا اور اس طرح کئی کئی دن اپنا دماغی توازن قائم رکھ سکتا مگر اچانک کسی دن بےاختیار ایسی جھجک دل میں اٹھتی کہ کھنچا ہوا مجبوراً ان کے ہاں چلا جاتا۔ وہاں نہ کسی کو اس کے آنے پر تعجب ہوتا اور نہ اعتراض۔ وہ تو گویا گھر کا فرد تھا۔ مگر جمیل پر اس کشاکش کا یہ اثر ہوا کہ وہ ظاہراً اور بھی سنجیدہ ہوتا گیا۔ اپنے مصاحبوں اور دفتر والوں میں اس کی باتیں اور بھی وقیع اور اس کی رائے صائب تر ہوتی گئی مگر اس کے دل کی لگن میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسے دیر سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس خلش کا باعث کیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نزہت کے دیکھنے سے اسے تسکین نہیں ہوتی، فقط باتیں ہی کرنے سے اسے کوئی دیرپا خوشی نہیں ہوتی۔ تھوڑے وقت کے لئے ایک نشہ ہو جاتا ہے مگر اس نشہ میں تلخی ضرور ہوتی ہے۔

وہ عام طور پر مضبوط ارادے کا آدمی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی طبیعت میں تلون بہت کم تھا۔ اسی لئے رفقا اس کی قدر بھی کرتے تھے، مگر یہ بات اس کی قدرت میں نہ تھی کہ نزہت کے ہاں نہ جائے، اور اگر جائے تو اپنی نظر شطرنج کے مہروں پر یا بوقتِ گفتگو اپنے ماموں کے سفید بالوں پر جمائے رکھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی نظر کو یوں قید بھی کئے رکھتا مگر اکثر اوقات قبل اس کے کہ اسے علم بھی ہو سکے وہ نزہت کو اٹھتے بیٹھتے کسی کرسی سے ٹیک لگائے یا کسی چوبی ستون سے سہارا لئے لا اُبالی انداز میں کھڑے دیکھ ہی لیتا۔ نزہت کے سرخ ہونٹوں سے اس کا شباب چھلک چھلک پڑتا اور وہ مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہتا حتٰی کہ اسے کوشش سے اپنی نظر ان ہونٹوں سے ہٹانی پڑتی۔ اس کے دماغ میں وہ ہونٹ شفق کی تابانی کی طرح چمکتے۔ اس کے خیالات ان لبوں کی سُرخی سے گلنار ہو جاتے۔ رات کو سوتے وقت ان کی یاد اس کے دماغ پر اس طرح چھا جاتی کہ وہ اکثر گھنٹوں نہ سو سکتا۔

نزہت اپنی جوانی سے فقط اس طرح واقف تھی کہ اب اسے ہنسی یوں ہی آجاتی اور وہ ہنستی تو بے اختیار ہو کر ہنستی۔ اس کی ہنسی میں وہ آزادی اور بے فکری ہوتی جو کسی ایسی ندی کے شفاف پانی میں ہوتی ہے جو ریت میں دھنسے ہوئے ننھے پتھروں پر سے لہراتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اس کی ہر جنبش میں بے ساختگی تھی، اس کا دِل افکار سے سبزا اور جذبات سے بے پروا تھا۔ جمیل کا آنا اس کے لئے معمولات میں سے تھا۔ جمیل کی نگاہوں میں اسے کبھی کوئی نئی چیز نظر نہ آئی تھی۔ جمیل کا جسم اسے اپنے مضبوط شانوں اور چوڑی چھاتی کی وجہ سے ہمیشہ سے پسند تھا۔ جمیل کا چہرہ نہ اسے کبھی غیر معمولی طور پر دلکش ہی لگتا تھا اور نہ اس کے نقوش میں اسے کوئی چیز بُری ہی لگتی تھی۔ وہ جمیل کے انداز سے مدت سے واقف تھی۔ جمیل اس کی نظر میں ہمیشہ سے باوقار رہا اور اس کی متین مسکراہٹ اسے ہمیشہ سے بھاتی تھی۔ ان دنوں حبِ تحسین سے بے خبر اور گرد و پیش سے بے پروا زندگی بسر کر رہی تھی۔ جمیل کا آنا نہ آنا، اس کے لئے کبھی اُلجھن کا باعث نہ ہوتا، وہ جمیل کی موجودگی سے لطف اندوز ضرور ہوتی مگر یہ دلچسپی بے خلش تھی۔ جمیل کی باتیں اسے پسند آتیں مگر اس کی نگاہوں سے وہ نہ گھبراتی شاید اس لئے بھی کہ جمیل اسے بہت کم نگاہ بھر کے دیکھتا۔ اور جب دیکھتا تو کسی لطیفہ یا بات کہنے میں ایسا مصروف ہوتا کہ اس کی نگاہ کسی جذبہ کی حامل نہ ہوتی۔ باتیں کرنے میں، ہنسنے ہنسانے میں وہ ہمیشہ کا سا جمیل تھا۔ سبھی اس کی بات کو توجہ سے سنتے، نزہت ہی پر کیا موقوف تھا۔ پھر جمیل عمر میں بھی اس سے بڑا تھا۔ تھوڑا بہت ادب بھی، کچھ پاس خاطر بھی منظور تھا۔ اس لئے نزہت جمیل کی باتوں کو دلچسپی سے سُنتی۔ یوں بھی جمیل اس کی نظر میں جہاندیدہ اور بالغ نظر شخص تھا، دُنیا کے مسائل کے متعلق اگر وہ کبھی توجہ دیتی تو اس وقت جب بھائی جمیل ان پر بحث کرتے۔ پھر ابّا بھی تو قدامت پرست ہونے کے باوجود جمیل کے منصفانہ اور مؤثر اندازِ بیان سے متاثر ہو جاتے۔ نزہت ہی کیوں نہ ہوتی۔

مگر اس کی توجہ جمیل کی جچی تلی اور پُر مغز باتوں کی طرف بہت آہستگی سے مبذول ہوئی۔ شروع میں تو اسے ان علمی مسائل کے متعلق خواہ سیاسی ہوں خواہ سماجی، کوئی تجسس ہی نہ تھا اس کے لئے اپنی دلچسپیاں ہی کافی تھیں۔ مگر جب کبھی اسے خیال آتا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے تو اسے کوئی خاص خوشی نہ ہوتی۔ اور تعجب کی بات تھی کہ یہ خیال اسے اسی دن آتا جس دن وہ بھائی جمیل کی باتوں کو سُن لیتی۔ مگر یہ احساس بہت دیر تک اس کے ذہن میں قائم نہ رہتا۔ شادی اس کے لئے ایک موہوم مستقبل کا نام تھا۔ اور اس کی تمام دلچسپیاں حال میں مرکوز تھیں۔ اب وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ ہر قسم کی کتب اس کی نظر سے گزرتیں، تاریخ سے اسے بہت اُنس تھا۔ مگر اب اسے شعر پڑھنے میں بھی لطف آنے لگا۔ ایف اے اور بی اے کے پہلے سال میں تو اسے اشعار اور خاص طور پر انگریزی نظموں سے قطعاً کوئی رغبت نہ تھی۔ ان کے الفاظ

کی خوبصورتی اور تشابیہ اور استعاروں سے وہ لطف اندوز ہولیتی مگر وہ شعر اس کے دل میں نہ اُترتے۔ بلکہ شعر پڑھتے اسے محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی گہرائی ہے بھی کہ نہیں۔ اب جبکہ امتحان میں چند ہی مہینے رہ گئے تھے اسے اپنی نصاب کی نظموں میں نئے معانی اور نیا تاثر نظر آنے لگا۔ وہ ان اشعار کو اب مزے لے لے کر پڑھتی۔

روز بروز انگریزی اور اُردو ادب سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اس کے احساسات اُبھتے گئے اور اس کی حس میں ذکاوت آتی گئی۔ اب وہ علمی مسائل میں دلچسپی لینے لگی۔ سماجی معاملات میں اسے کوئی ذاتی انہماک نہ تھا مگر پھر بھی سہیلیوں، ہم جماعتوں اور اپنی پروفیسروں سے ان مسائل پر گفتگو کرتی رہتی۔ بلکہ اپنے ابا سے بھی وہ کبھی کبھی ہندوستان کے سیاسی اور معاشری مستقبل کے متعلق تذکرہ چھیڑ بیٹھتی اور ایک آدھ دفعہ تو وہ جمیل اور اپنے ابا کی بحث میں شریک بھی ہوگئی۔ اگرچہ یہ دن اس کے لئے بہت قیمتی تھے مگر وہ غیر نصابی کتابوں میں زیادہ منہمک رہتی۔ اب وہ اپنے خاوند کے متعلق جو اتنے عرصہ سے ولایت میں تھا سوچتی۔ لوگ اس کی بابت اس کی والدہ سے پوچھتے مگر نزہت کو نہ معلوم ہوتا کہ وہ وہاں اب کیا کرتا ہے۔ اگرچہ اپنے ہونے والے خاوند سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر جب کبھی وہ شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق سوچتی تو اس کا دل عجیب عجیب آرزوؤں کا آماجگاہ بن جاتا۔ مگر اس سے وہ دیر تک کبھی مضطرب نہ ہوتی، اس کی طبیعت کا اصلی جوہر بے فکری تھی۔ اور وہ طمانیت جو عام طور پر اس کے دل و دماغ میں جلوہ فگن رہتی اسے ایسی پریشانیوں سے بچالیتی۔ نیز ان موہوم اور غیر متشکل خواہشات کا مرکز کبھی اس کا خاوند نہ ہوتا۔ جب کبھی وہ بے وجہ افسردہ ہوجاتی تو اسے خود معلوم نہ ہوسکتا کہ اس کے اعضا میں شکستگی سی کیوں محسوس ہورہی ہے۔

امتحان کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اسے اپنی تمام توجہ کتب بینی پر صرف کرنی پڑی۔ مگر امتحان کے بعد اسے فراغت مل گئی تھی۔ ان دنوں وہ پڑھتی تو رہتی مگر اکثر ایسے لمحات آجاتے جب وہ اپنی توجہ پوری طرح سے کتاب کے حروف پر نہ جما سکتی۔ اس کے دل میں بلاوجہ انتشار سا پیدا ہوجاتا اور وہ اس سے خیالات کے عجیب گورکھ دھندوں میں جا پڑتی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ نہ اب اسے کالج جانا ہوتا اور نہ وہ ہر روز اپنی سہیلیوں سے مل ہی سکتی۔ اور نہ لوگ ہی ہر روز اس کے ہاں آتے۔ ملنے والیوں میں بہت سی ایسی تھیں، جو فقط اس کی والدہ ہی سے ملنے آتیں اور جو کوئی ہم عمر رشتہ دار آ بھی جاتی تو وہ سوائے اشرف کے نزہت سے کوئی بات ہی نہ کرتی۔ اور نزہت کو اپنے ہونے والے خاوند کے متعلق بات چیت کرنے میں حجاب ہی نہیں تھا بلکہ اسے ان مہمل استفسارات کا جواب دیتے اُلجھن ہوتی۔ اور اگرچہ اشارات کنایات کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اشرف ولایت میں آوارہ زندگی بسر کر رہا ہے مگر اسے اس سے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اس کی پریشانی کا باعث تنہائی تھی۔ وہ جس کے دن رات مشاغل سے بھرے رہتے تھے اور جسے سانس لینے میں ہی لطف آیا کرتا تھا اب کبھی کبھی اپنے تئیں اکیلا محسوس کرتی اور یہ احساس ان دنوں زیادہ قوی ہوتا جب بھائی جمیل بھی ابا سے ملنے نہ آتے۔

جمیل کے جذبات کشاکش پنہاں کے باوجود اس کے وقار کے تلے دبے ہی رہتے تھے اور اب تو انہیں اس ضبط کے مقابلہ

میں شکست ہوتی جارہی تھی ۔ نزہت کی موجودگی میں جمیل پر وہی اثر اور اس کے بدن میں وہی پرانا نشہ سرایت کرتا محسوس ہوتا اور اس کی آنکھیں اسی مجبوری سے نزہت کی طرف اُٹھ جاتیں مگر اب اس نے اپنی تنہائی کا ایک علاج ڈھونڈ لیا تھا ۔ وہ دوستوں کے اصرار پر اپنے دفتر کے ٹینس کلب کا ممبر ہوگیا اور پہلے تو عمداً اور اپنے آپ پر جبر کر کے روزانہ شام کو وہاں جاتا اور اتنا کھیلتا کہ گھر آتے آتے تھک جاتا مگر کچھ عرصہ بعد جب اسے کھیلنا آگیا تو اسے ٹینس سے دلچسپی ہوگئی ۔ اور پھر وہاں احباب کی محفل بھی روزانہ گرم ہوتی ۔ بعض دفعہ تو وہ برج کھیلنے لگ جاتے تو کھانے کا وقت بھی گزر جاتا ۔

ان مصروفیتوں کے باوجود بھی جمیل کے دل میں نزہت کی یاد ایک زخم کی طرح تازہ تھی ، اس کے ہونٹ ، اس کے کولہے ، اس کے دل میں ایک دائمی خلش کی صورت میں جاگزیں تھے مگر اب یہ ہوتا کہ نزہت کے ہونٹوں کا تصور اسے پاگل نہ کر دیتا ۔ ان کی سُرخی اس کے دل میں وہی ولولے پیدا کرتی مگر اب وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی جراٗت بھی کر لیتا ۔ اور جب وہ وہاں جاتا تو اب اکثر وہ نزہت کو خود ہی گفتگو میں شامل کر لیتا اور اگرچہ نزہت کی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہتی ، وہ اکثر نزہت سے نظر ملا کے سوال بھی کر لیتا ۔ نزہت اس کے لئے اب بھی رعنائی کا پیکر تھی مگر اب اس میں اتنا حوصلہ ہوگیا تھا کہ اس کے جسم کو سر سے پاؤں تک دیکھ کے بھی اپنے حواس قائم رکھ سکے اور اپنے ماموں سے اور نزہت اور گھر والوں سے نہایت سنجیدہ انداز سے باتوں میں مشغول رہ سکے ۔ مگر اب پورے دو دو ہفتے گزر جاتے اور وہ اپنے آپ کو وہاں جانے سے باز رکھ سکتا ۔

ادھر نزہت کی زندگی اور بھی ذہنی ہوتی گئی ۔ وہ اب بی ۔ اے کر چکی تھی ۔ اس کی شادی کے متعلق اب اس کے والد اور والدہ کبھی کبھی اس کے سامنے ہی گفتگو کر لیتے اور اشرف کے متعلق اس کے ابا کے خیالات تو کسی سے پوشیدہ ہی نہ تھے ۔ مگر نزہت کا اشرف کے ذکر سے اُلجھن چھوڑ اب نفرت ہوتی جارہی تھی ۔ اوّل تو وہ ان باتوں پر کان ہی نہ دھرتی اور اگر اس معاملہ کے متعلق سوچتی بھی تو اسے بھائی جمیل کی وہ گفتگو یاد آجاتی جس میں اُنہوں نے کہا تھا کہ "زندگی تو نہ ملنے والی چیزوں کی جستجو کا نام ہے ، خوشی بھی اسی تمنا سے وابستہ ہے اور غم بھی" انہیں باتوں پر غور کرتے کرتے جب اسے بھائی جمیل یاد آجاتے تو وہ کافی دیر تک ان کے متعلق سوچتی رہتی ۔ اسے اس بات سے بھی تکلیف ہونے لگی کہ ان کا آنا اب کم ہوگیا ہے ۔ بعض دفعہ تو وہ انتظار کرتے کرتے بے چین ہو جاتی ۔

نزہت کا دِل اس بے کلی سے مانوس ہو چلا تھا ۔ مگر جمیل نے فیصلہ کر لیا کہ ماموں جان کے ہاں جانے میں اُسے سوائے حسرت کے اور کچھ حاصل نہیں ۔ سو اس نے وہاں جانا اور بھی کم کر دیا ۔ اسے اب کسی عہد کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی ۔

سیّد فیاض محمود

چنچل

"کبھی آپ ہنسو، کبھی نین ہنسیں، کبھی نین کے بیچ ہنسے گجرا"
کبھی سار اسُندر انگ ہنسے، کبھی انگ رُکے، ہنس دے گجرا!
یہ سُندرتا ہے یا کوتا، میٹھی میٹھی مستی لائے،
اس روپ کے ہنستے ساگر میں ڈگ مگ ڈولے من کا بجرا!

کیا ناز انوکھے اور نئے سیکھے اندر کی پریوں سے؛
اور ڈھنگ منوہر اور زہری سُوجھے ساگر کی پریوں سے؛

یہ موہن مدھ متوالی ہے، یہ مے خانے کی چنچل ہے،
یہ رُوپ لٹاتی ہے سب میں، پر آدھے مُنہ پر آنچل ہے،
پہلے سپنے میں آتی ہے؛ پازیبوں کی جھنکاروں میں
پھر چین چرُا کر تن من کا، چھُپ جاتی ہے سیاروں میں!

میراجی



خوشی



مشاعرہ بزم اُردو شملہ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷

سب سے پیچھے کھڑے ہوئے

(۱) مسٹر بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی (۲) مسٹر ڈی ڈی کپور (۳) مسٹر اختر حسین (۴) مسٹر الیشور دیال (۵) مسٹر حسین ملک

کھڑے ہوئے

(۶) مسٹر کستوری لال چوپڑہ (۷) میر محمد مرتضیٰ علی (۸) مسٹر قدیر احمد خاں قدیر لکھنوی (۹) میرزا جعفر حسین لکھنوی (۱۰) سید نجم الحسن (۱۱) میاں بشیر احمد (۱۲) مسٹر کشن داس زار (۱۳) بوم میرٹھی

(۱۴) سید حسن فیروز (۱۵) خان بہادر محمد مظہر (۱۶) سید نواب میاں (۱۷) خان بہادر ظفر حسن خاں (۱۸) سید احمد میاں (۱۹) مسٹر حبیب ملک

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے

(۲۰) جناب احسان دانش (۲۱) پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (۲۲) میرزا ثاقب لکھنوی (۲۳) آنریبل سر سید سلطان احمد (صدر مشاعرہ) (۲۴) ملک غلام محمد (صدر بزم اردو) (۲۵) مولانا بیخود دہلوی (۲۶) بہزاد لکھنوی

فرش پر بیٹھے ہوئے

(۲۷) پنڈت بالمکند عرش ملسیانی (۲۸) مسٹر عبد السلام (۲۹) مسٹر محمد اسد خاں اسد ملتانی (سکرٹری بزم اردو) (۳۰) سید تنویر علی (۳۱) مسٹر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (۳۲) مسٹر محمد زمان خان

م ۔ ک ۔ ن ۔ ب

دُنیا بھر کی دلچسپ باتیں بھی اُسی وقت یاد آتی ہیں جب ہم چار پانچ بے تکلّف دوست کہیں پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک شام گجرات کے مشہور شاعر اُستاد امام دین کے بلند پایہ اشعار سننے کے بعد جب قہقہوں کی آوازیں بند ہوگئیں تو شمیم نے اُستاد کا دیوان "بانگِ دہل" میز پر رکھتے ہوئے کہا "اکرم! ہاں! وہ گھنٹی والی بات تو تم نے ان لوگوں کو سُنائی ہی نہیں"۔ اکرم بولا "ہاں! بھئی سنو ایک اور دلچسپ بات جو میں کبھی نہیں بھُولتا۔

جب سب نے اپنے اپنے سگرٹ سلگا لئے تو اکرم نے جسے پُرانی باتیں بیان کرنے میں خاص مہارت ہے ایک لمبا کش لگاتے ہوئے اپنی داستان یوں شروع کی:-

"خاکسار جب تھرڈ ایر میں گیا تو کچھ عرصہ کے بعد پرنسپل نے صرف ذاتی دُشمنی کی وجہ سے ہمارے ریاضی کے بھلے چنگے پروفیسر کو کالج سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہم لوگوں نے بہت شور مچایا مگر کچھ نہ بنا اور چند ہی دنوں میں ہم پر ایک ایسا پروفیسر نازل کر دیا گیا جو تھا تو میری ٹانگ سے ذرا بڑا مگر آتے ہی چاہتا تھا کہ وہ کھانسے بھی تو لڑکے ڈر کے مارے کمرے کے کونوں میں دبک جائیں۔ پاکٹ سائز پروفیسر ہم پر روز جتنا رعب بٹھاتے ہم اُتنا ہی ہنستے کہ بیٹھا کرتا کیا ہے۔ چند ہی دنوں میں سارے کالج میں مشہور ہو گیا کہ "فرنٹیر" میں نئے پروفیسر کو اُنگلیوں پر نچایا جاتا ہے۔ ہمارے کمرے کالج کی بڑی عمارت سے ذرا ہٹ کر نئے نئے بنے تھے اور ہم اپنے بلاک کو اپنی آزادی اور بے باکی کی رعایت سے "فرنٹیر" کہا کرتے تھے۔

ایک دن آپ پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی لڑکے نے زور سے سیٹی بجائی۔ پروفیسر نے جھلّا کر کہا "کون ہے یہ سیٹی بجانے والا؟" میں نے بیٹھے بیٹھے کہہ دیا "پھجّا" (فضل سے بگاڑ کر) آپ کو اور غصّہ آگیا اور سٹیج سے اُتر کر کہنے لگے "مسٹر پھجّا کھڑے ہو جائیں" مگر کوئی نہ اُٹھا۔ آپ نے پھر طیش میں کہا "مسٹر پھجّا کیوں کھڑے نہیں ہوتے"۔ لڑکے ہنس دیئے۔ آپ نے پھر کڑک کر کہا "مسٹر پھجّا خود ہی کھڑے ہو جائیں نہیں تو میں اُن کے خلاف سخت کارروائی کروں گا" اتنے میں ایک لڑکے نے ہنستے ہوئے اُٹھ کر کہا "جناب گستاخی معاف! پھجّا تو جماعت میں کسی لڑکے کا نام ہی نہیں۔ پھجّا تو ہوسٹل کا حجام ہے"۔ لڑکوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پروفیسر زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر یہ جا وہ جا۔

دوسرے دن پرنسپل کی طرف سے ساری کلاس کو تین تین روپے جرمانہ ہوا اور ساتھ ہی یہ نوٹس بھی ملا کہ اگر آئندہ کسی لڑکے نے ذرا سی بھی شرارت کی تو اُسے پانچ روپے تک جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑکے جُرمانے سے ڈر گئے اور شرارتیں بہت کم ہوگئیں۔ ایک دن پروفیسر مُدک مُدک کر پڑھا رہا تھا میں نے خاموش جماعت کی نالائقی پر ایک لمبی سرد آہ بھری، تو صرف آہ بھرنے پر ہی مجھے ایک روپیہ جرمانہ سنا دیا گیا۔

چند دن بعد کا ذکر ہے کہ پروفیسر بورڈ پر کچھ لکھنے کے لئے گیا تو جماعت میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ لیکن جب اُس نے ذرا مُڑ کر دیکھا تو آواز فوراً بند ہو

گئی ۔چند منٹ کے بعد جب پھر وُہ کچھ لکھ رہا تھا تو گھنٹی بجی اور وہ ابھی مُڑ کر دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ آواز بند ہو گئی ۔پروفیسر کچھ حیران سا ہُوا مگر اُس نے پھر لکھنا شروع کر دیا ۔آہستہ سے ٹن . . . ٹن . . . ٹن کی آواز پھر آئی تو پروفیسر نے طیش سے چاک کا ٹکڑا زمین پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے؟" لڑکے خاموش تھے اُسی وقت کوئی شخص پروفیسر سے ملنے کو آگیا اور وہ چلا گیا ۔دوسرے دن پھر پروفیسر نے آکر پڑھانا شروع کیا اور ابھی اُس نے بورڈ کی طرف مُنہ موڑا ہی تھا کہ پھر گھنٹی کی آواز آئی ٹن ٹن ٹنا ٹن !!! لیکن اُس نے پلٹ کر دیکھا تو جماعت بالکل خاموش تھی ۔پروفیسر نے جھلا کر کہا "یہ کل سے ٹن ٹن کی کیا آواز آرہی ہے ۔کون گھنٹی بجاتا ہے" ایک لڑکے نے جواب دیا "وہ باہر گراؤنڈ میں بکری چر رہی ہے اُس کے گلے میں شاید گھنٹی ہو" پروفیسر نے لڑکوں کو کھڑا کر کے ساری کلاس کے ڈسکوں کی تلاشی لینی شروع کر دی اور غصہ میں کہا "یہ بکری اُسی وقت چرتی ہے جب میں بورڈ کی طرف لکھنے جاتا ہوں" نیچے اوپر تلاش کرنے کے بعد جب پروفیسر کو گھنٹی نہ ملی تو وہ سر کھجلاتا ہُوا اپنی کُرسی پر جا بیٹھا اور کچھ کہے بغیر پھر پڑھانا شروع کر دیا ۔چند منٹ کے بعد وہ بورڈ کی طرف گیا تو گھنٹی پھر بجی ٹن ٹن ٹنا ٹن ٹن !!!! پروفیسر نے فوراً لڑکوں کو ڈسکوں سے باہر آنے کا حکم دیا اور کھڑا کر کے اُن کی جامہ تلاشی لی ۔ڈسکوں کو دوبارہ دیکھا ۔کمرے کے کونے دیکھے ۔ڈسکوں کے نیچے دیکھا ۔مگر کچھ نہ ملا ۔لڑکے بالکل خاموش تھے ۔پروفیسر حیران تھا ۔غصہ سے اُس کا مُنہ لال تھا مگر ضبط کرتے ہوئے وہ ہمیں "بیٹھ جائیے" کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا ۔اس نے دوبارہ لیکچر شروع کر دیا اور جب بورڈ پر لکھنے کے لئے گیا تو اس دفعہ ذرا زیادہ بلند آواز سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی ٹن ٹن ٹنا نا نا ٹن !!! ۔اُف پروفیسر کی حالت ایک ایسے بھُوکے شیر کے مانند تھی جو بند پنجرے کی سلاخیں توڑ کر باہر کے لوگوں کو چیر پھاڑ دینا چاہتا ہو ۔مگر وہ بار بار ہماری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔اتنے میں کالج کی گھنٹی بج گئی اور وہ اپنی کتابیں لے کر چلا گیا ۔

تیسرے دن ہم جب ایک دوسرے کمرے سے آکر اپنے کمرے میں داخل ہونے لگے تو پروفیسر پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا ۔باری باری اُس نے تقریباً تین پینتیس لڑکوں کی اچھی طرح سے تلاشی لے کر اُنہیں اندر جانے کی اجازت دی ۔جب سب لڑکے اندر آگئے اور پروفیسر کو کچھ نہ ملا تو وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا ۔تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرے کے باہر کالج کے تین چار چپراسی چکر لگا رہے ہیں ۔پروفیسر پھر لکھنے کے لئے گیا تو پھر گھنٹی کی آواز آئی ۔اُس نے چپراسیوں کو بُلا کر پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ کمرے کے باہر کوئی لڑکا نہیں ۔چپراسی چلے گئے تو پروفیسر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا ۔اُس کی حالت اب قابلِ رحم تھی ۔چند منٹ کے بعد اُس نے جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے عزیزو ! یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے . . . . . مجھے یقین ہے کہ گھنٹی تم ہی میں سے کوئی بجاتا ہے یا تمہیں علم ہے کہ گھنٹی کس طرح بجتی ہے ۔اگر تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ میں تمہیں پڑھاؤں اور تمہیں میری صورت ہی سے نفرت ہے تو میں کل سے نہیں آؤں گا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شرارت کون کرتا ہے میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں شرارت کرنے والے کو کسی قسم کی سزا نہیں دونگا اور میرے دل میں اُس کے خلاف کبھی بغض نہ ہو گا" بٹوے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا "بلکہ میں اُسے انعام دینے کے لئے تیار ہوں ۔یہ سب کچھ میں نے تمہیں ایک پروفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے کہا ہے" کلاس میں چند منٹ تک خاموشی رہی ۔لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔میں ہنستا ہُوا اُٹھ کر پروفیسر کے پاس گیا اور اپنی پگڑی اُتار کر اُس کی میز پر رکھ دی جس کے لمبے سے شہدی کلاہ میں چھوٹی سی گھنٹی لٹک رہی تھی ۔پروفیسر نے مُسکراتے ہوئے میری پگڑی پہن لی ۔اور اپنے سر کو ذرا ہلاتے ہوئے کہا "اچھا ! یوں بجاتے ہیں اسے ٹن ٹن ٹنا ٹن ٹن !!! ۔کلاس ایک دفعہ پھر قہقہوں سے گونج اُٹھی ۔

فاروق علی خاں

کلامِ شاد

مرسلۂ آنریبل شیخ سر عبدالقادر سابق مدیر "مخزن"

میرے ایک دوست ترمبنی سرن صاحب شاد بی۔اے، ایل۔ایل بی ہیں جو آج کل بھوپال میں سب جج ہیں۔ وہ اُردو کے قدردان ہیں اور اُردو غزل خوب کہتے ہیں مجھے اُن کا کلام سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے یہ دو غزلیں اُن سے آپ کے رسالہ "ہمایوں" کے لئے مانگ لی تھیں۔ ارسال خدمت ہیں۔ والسلام

آپ کا مخلص
عبدالقادر

ہمایوں۔ ہم آنریبل سر عبدالقادر کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے شاد صاحب کی یہ مرصّع غزلیں "ہمایوں" کے لئے حاصل کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

(۱)

آسماں بھی تو آسماں نہ رہا — برق چمکی جب آشیاں نہ رہا

دل کا جلنا کبھی نہاں نہ رہا — شعلے نکلے اگر دھواں نہ رہا

کوئی عنوانِ داستاں نہ رہا — ضبط بھی داخلِ فغاں نہ رہا

بوستاں ہے وہی مگر صیّاد — بوستاں اب وہ بوستاں نہ رہا

دل مرا یا تری نظر ظالم — کون نشتر قریبِ جاں نہ رہا

کیا قفس بھی قفس نہیں اپنا — آشیاں خیر آشیاں نہ رہا

دل کو اچھا کیا مِٹا ڈالا — اب کوئی رازداں میاں نہ رہا

تیرے مٹنے کا غم نہیں اے شاؔد
تختۂ مشقِ آسماں نہ رہا

(۲)

عیش ہے بے نیازِ ماتم کیا
خلد سے دُور ہے جہنّم کیا

انبساطِ امید کا غم کیا
عیشِ فردا کا آج ماتم کیا

اب کہیں کچھ نظر نہیں آتا
ہو گئے ہم اور آپ باہم کیا

دردِ بہیم کا نام دل تو نہیں
اِک نظر کر گئی فراہم کیا

سچ بتا دے اب اے غمِ ہستی
اَور بھی ہے کوئی جہنم کیا

صاف تھا راز دل دھڑکنے کا
کر دیا تم نے یہ بھی مُبہم کیا

پوچھئے خلد کے فرشتوں سے
آدمی کی نظر میں آدم کیا

سازِ دل تو سکوت میں ہے شاؔد
سُن رہا ہوں صدائے برہم کیا

تریبنی سرن شاؔد

مصیبت کے ساتھی

صحرا کی رات آباد میدان یا پہاڑ کی رات سے مختلف ہوتی ہے۔ میدان میں ہریاول کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی آوازیں مل کر خواب آور سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور آہستہ آہستہ ایک رنگ بھرا سایہ سا تمام زمین پر چھا کر اسے اپنے آغوش میں لے لیتا ہے۔ پہاڑ پر آناً فاناً جادو کا پُراسرار پردہ گرتا ہے اور اسٹیج کی طرح نظارے کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے صحرا کی رات۔ تاریک خاموشی اور بس ــــ ایسی خاموشی جسے توڑنا گناہ معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے صحرا کے رہنے والے خاموشی پسند ہو جاتے ہیں۔

لیکن سراج اور مُراد کی باتیں بند نہ ہوتی تھیں۔ آگ بجھ چکی تھی اور وہ حسبِ معمول ایک دوسرے کو پیار سے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ جو پنجاب کے جاہل یا تھوڑا بہت پڑھے لکھے لوگوں میں عام دستور ہے۔ گویا ہر فقرے کے ساتھ گالی دینا بے تکلفی اور باہمی اُنس کا خاص نشان ہے۔ کبھی کبھی اس گفتگو میں ان کے تیسرے ساتھی کو بھی مخاطب کر لیا جاتا تھا جو اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے چُپ چاپ ایک طرف کھڑا تھا اور جس کا نام اُنہوں نے اس کی صابرانہ سیدھی چال اور دُنیا میں سب سے زیادہ بے ہنگم صدا کی بنا پر جو دُور دراز وطن میں ان کے گاؤں کے چوکیدار عرف مُلّاجی کی آواز سے مشابہ تھی۔ مُلّاجی رکھا ہوا تھا۔

مراد نے کہا "ارے اب سگرٹ ہی پیئے جاؤ گے یا سونے کی بھی فکر ہے؟ تم چمگادڑ کی نسل سے تو نہیں ہو؟"

سراج نے بدستور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سگرٹ کا لمبا سا کش لگا کر جواب دیا "تمہیں تو دودھ پیتے بچے کی طرح ہر وقت نیند ہی آئی رہتی ہے۔ انگوٹھا چوسنا شروع کر دو طبیعت بہل جائے گی ــــ اب سو کر کیا کریں گے؟"

"ابھی؟ میں تو جانتا ہوں آدھی رات ہونے کو آئی؟"

"یہاں تو شام پڑتے ہی آدھی رات ہو جاتی ہے ــــ"

"آخر کرو بھی کیا رہے ہو۔ آسمان سے کوئی پری تو تمہیں تھپک کر سُلانے کے لئے آ جانے سے رہی!"

"میں ذرا اپنی جوانی کے گناہوں کی یاد کے مزے لے رہا ہوں۔ تمہیں پری کی خواہش ہے تو مُلّاجی کے بال کافی لمبے ہیں ان سے کھیلنا شروع کر دو۔ تصوّر بڑی چیز ہے"

مُراد نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جوانی ــــ؛ مجھے تو اب جوانی کے خواب بھی نہیں آتے۔ ہم تینوں میں سے اگر کسی کی جوانی باقی ہے تو مُلّاجی کی۔ اور وہ بھی بیکار برباد ہو رہی ہے"

اس قسم کی باتیں ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ کیونکہ اور کوئی تفریح کا سامان نہ تھا۔ افریقہ میں مزدوری کرنے آئے تھے لیکن صحرا کے ایک

حصے میں سونا نکلنے کی خبر سُن کر اس کام میں لگ گئے تھے۔ چھ مہینے سے اس جگہ ایک چھوٹا سا خیمہ لگائے پڑے تھے۔ دن بھر پتھر کھودنے اور توڑنے میں مصروف رہتے اور باوجودیکہ اس عرصے میں سونے کے ذرّات سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں کی بہت سی مقدار ان کے تھیلوں میں بھر چکی تھی تاہم کبھی کبھی اُداسی غلبہ پالیتی اور ایسے وقت میں اُن کے تیسرے ساتھی یعنی گدھے کی موجودگی بھی غنیمت معلوم ہوتی۔

چاروں طرف میلوں تک خالص ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ دن میں سورج کی تپش سے تمام علاقہ جلتے ہوئے توے کی مانند ہو جاتا۔ وقتاً فوقتاً کئی ہفتے کے وقفے سے دونوں قریب ترین قصبہ میں جو کم و بیش ایک سو میل کے فاصلے پر تھا پانی لینے کے لئے جاتے اور چند پیسے کرائے کے گدھوں یا اونٹوں پر لدوا کر لے آتے۔ چونکہ ڈیرے میں پہنچنے کے بعد غسل کا تو خیال کرنا ہی بیکار تھا اور پانی پینے والے تین ہی تھے اس لئے یہ پیپے ایک عرصہ تک کافی ہو جاتے۔

باتیں کرتے کرتے دونوں سو گئے۔ تمام دن محنت کرنے کے بعد خاموش رات میں نیند بہت جلد آتی ہے لیکن صحرا میں رہنے والوں کو ذراسی آہٹ فوراً جگا بھی دیتی ہے۔ ابھی آنکھ لگی تھی کہ یکلخت دونوں نے سر اُٹھائے اور مُراد نے آہستہ سے پوچھا "کیا تم نے کچھ سنا؟"

"سُنا نہیں تو جاگا کس لئے ہوں۔ تمہارا خوبصورت چہرہ دیکھنے کے لئے؟"

وہ غور سے سننے لگے۔ کچھ فاصلے پر کسی بھاری گاڑی کے چلنے کی سی آواز آرہی تھی۔ مُراد بولا "کرایہ کی گاڑی کسی سونا کھودنے والے کا سامان لئے جارہی ہے۔ لیکن اتنی رات گئے ——؟"

وہ پھر لیٹ گئے اور سُنتے رہے۔ آواز قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھیکی سی چاندنی میں گاڑی کا سیاہ دھبا آہستہ آہستہ حرکت کرتا نظر آیا۔ دونوں کھڑے ہو گئے اور آواز دی —— صحرا میں واقفیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسانی آواز تعارف کے لئے کافی ہوتی ہے —— لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ گاڑی کی رفتار میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

دونوں نے مِل کر پھر آواز دی اور پہلے کے مقابلہ میں زیادہ زور سے۔ اب گاڑی کا فاصلہ ان سے ایک سو گز سے زیادہ نہ ہوگا۔ جواب پھر بھی خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سراج لیٹ کر سو جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یکلخت مُراد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "کچھ بات ہے سراج —— اس گاڑی کو پکڑنا چاہئے —— ارے میرا جوتا کہاں چلا گیا ——" دونوں جلدی جلدی جوتے تلاش کر کے پہننے لگے۔ "اوّل تو رات بہت آگئی ہے۔ یہ کوئی عام راستہ بھی نہیں —— اور خچروں کے جھکے ہوئے سر بتاتے ہیں کہ ان کی لگام ڈھیلی ہے۔ آؤ دیکھیں تو ——"

دونوں دوڑتے ہوئے گاڑی کی طرف چلے اور تھوڑے ہی عرصے میں اسے جالیا۔ مُراد نے خچروں کو پکڑ کر روک لیا اور سراج کود کر اُوپر چڑھ گیا۔ پہلے تو چاند کی دُھندلی روشنی میں کچھ پتہ نہ چلتا تھا لیکن جُھک کر غور سے دیکھنے پر وہ فوراً پیچھے ہٹا۔ حیرت سے اس کی زبان بند ہو گئی۔

گاڑی میں دو انسانی صُورتیں بالکل ساکت اور خاموش پڑی تھیں۔ ایک معمر آدمی تھا جو غالباً پہلے خچروں کو ہانک رہا ہوگا۔ باگیں اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں اور وہ پُشت کے بل گر کر گاڑی کے فرش پر آگیا تھا۔ چونکہ خچروں کو کسی نے روکا نہ تھا وہ برابر چلتے رہے تھے آدمی مر چکا تھا خدا جانے بڑھاپے اور کمزوری سے یا کسی مرض کی وجہ سے۔ دوسری ایک چھوٹی سی یورپین لڑکی تھی جس کی عمر سات آٹھ برس کی ہوگی۔ اس کے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے اور گرد کی ایک موٹی تہ نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔ تاہم وہ زندہ تھی اور گہری نیند سو رہی تھی۔

اُس رات صحرا کی ریت میں ایک قبر کھودی گئی —— ایسی سینکڑوں اُس راستے پر بن چکی اور مٹ چکی تھیں —— لڑکی کو آہستہ آہستہ شانہ ہلا کر جگایا گیا۔ اس نے چند آنسو بہائے جن میں غم بھی تھا اور خوف بھی۔ اور بتایا کہ یہ بڈھا اس کا چچا تھا۔ باپ کہیں دُور گیا ہؤا تھا۔ مراد نے اسے گود میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پھر سو گئی۔ خچروں کو کھول کر وہ پانی پلایا گیا جو گاڑی میں موجود تھا اور جدھر سے آئے تھے اس طرف کو منہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ انہیں اپنے پاس رکھا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ان کے لئے پانی کہاں سے آتا۔ دو دن تک اگر سیدھے دوڑے چلے گئے تو آبادی تک پہنچ جائیں گے اگر راستے سے بھٹک گئے تو موت کا لقمہ ہو جائیں گے۔

صبح ہوئی تو دونوں آدمی چولھے کے پاس بیٹھ کر کھانا پکاتے ہوئے دیر تک آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ مُراد نے تجویز کی کہ لڑکی کو قریب ترین آبادی میں پہنچا دیا جائے جہاں شاید اس کے اعزہ رہتے ہوں لیکن سراج نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں اگر کوئی عزیز ہوں گے تو خچروں کو دیکھ کر خود بخود تلاش کرنے آئیں گے۔ لیکن دل میں دونوں ان تجاویز میں سے کسی سے موافق نہ تھے۔ تنہائی کی تکلیف اس قدر تھی کہ اس لڑکی کا آجانا خدا کی طرف سے نعمتِ غیر مترقبہ کی شان رکھتا تھا۔ آخر مراد نے کہا۔

"اچھا تو نہ سہی۔ اگر عزیز ہوتے تو اس پیرِ فرتوت کے ساتھ ایسی پیاری لڑکی کو صحرا کے حوالے کیوں کر دیتے۔ اگر اتفاق سے ہمیں گاڑی کا علم نہ ہو جاتا تو لڑکی بھی اُور ایک آدھ دن میں مر جاتی اور خچر پیاس کے مارے دیوانے ہو جاتے۔ ہمیں کیا غرض پڑی ہے کہ اس کے اقربا کو تلاش کرتے پھریں ——"

سراج بولا "یہ بات کہی نا! آج مدت کے بعد تمہارے بھوسہ بھرے ہوئے دماغ میں بھی عقل کی چنگاری پیدا ہوئی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے ہمارا جی بہلے گا۔ عمر اکیلے رہتے رہتے گزر گئی۔ بال سفید ہو گئے۔ اب اگر اللہ نے رحم کھا کر ایک پیاری پیاری بولتی ہوئی گڑیا ہماری گود میں لا کر ڈال دی ہے تو جب تک ممکن ہو سکے کیوں نہ ہم اس سے کھیلیں اور باپ ہونے کا لُطف اٹھائیں"۔

"کیا کہنے! ہیں تو ہم دونوں اسی قابل کہ خوبصورت بچے ہماری کانٹے دار داڑھیوں میں پیار سے اُلجھا کریں"۔

اتنے میں لڑکی کی آنکھ کھل گئی۔ اور دونوں اپنے اپنے طریق پر اس کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئے۔ پھر ان میں سے کسی نے نہ کہا کہ اسے واپس پہنچا دیا جائے۔ تمام دن کچھ کام نہ ہؤا کھدائی وغیرہ سب بھول گئی۔ غلّاجی بیچارہ چلایا کیا کسی نے اس کی بات تک نہ پوچھی۔

اسی طرح دو تین دن گزر گئے۔ یہ گویا تعطیلیں تھیں جن میں تفریح کے مشغلہ کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔ گھنٹوں بیٹھے لڑکی کی بھولی بھولی باتیں سنتے۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے پیار دلاسے کی باتیں کرتے اور اس کی آئندہ زندگی کے متعلق خیالی پلاؤ پکاتے رہتے۔ گو دل میں دونوں جانتے تھے کہ یہ لہو ولعب کا زمانہ چند دن کی بات ہے۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہونے پر سب کو آبادی کی طرف پانی

لینے جانا پڑے گا۔ وہاں لڑکی کے عزیز و اقربا ہوں گے اور نہ ہوئے تو وہاں کا طبقۂ اُناث ان دو پر کٹے بڈھے کبوتروں کے اس بلبل ہزار داستان کے مستقل باپ بن جانے کو کب گوارا کرے گا۔

اُنھوں نے اس زمین کے متصل جس پر سونا نکالنے کے لئے خود قبضہ کر رکھا تھا ایک اور بڑے سے ٹکڑے پر نشان گاڑ کر لڑکی کے نام سے قبضہ کر لیا اور ان کے ہوائی قلعے میں گویا ایک اور حصّے کا اضافہ ہو گیا۔

آخر ایک رات جب لڑکی اپنے نرم نرم بستر پر سو گئی جو دونوں نے اپنی رضائیاں ملا کر بنا دیا تھا اور خود آخری رات کی سردی میں سکڑ سکڑا کر گزارا کر رہے تھے، تو سراج نے لیٹے لیٹے کہا "صرف ایک پیپا باقی رہ گیا ہے مُراد۔ اب دو تین روز میں روانہ ہو جانا چاہیئے تاکہ راستہ کے لئے پانی کافی ہو۔"

مُراد نے سوچتے ہوئے کچھ دیر کے بعد اس انداز سے جواب دیا گویا اس کے دِل میں یہ بات پہلے ہی کھٹک رہی تھی۔ "دو دن میں بیوقوف۔ پیپا پورا بھرا ہؤا نہیں۔ اپنا خیال کرو یا نہ کرو لڑکی کا ساتھ ہے پوری احتیاط چاہیئے۔"

سراج نے لمبی سانس لی "ہاں۔ دو ہی دن سہی۔ صحرا میں موسمِ بہار کب تک رہتا۔"

"پھر وہی تصوّر کے سبز باغ! یہاں تو ایسے خیالات بھی ہوا میں جھلس کر رہ جاتے ہیں۔"

"تمہارے مُنہ کے ساتھ دِل پر بھی صحرا کی مٹی جم کر رہ گئی ہے۔ ابکی شہر کو جاؤ تو دونوں کو صابن سے دھلوا لینا ——"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے سو گئے لیکن تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کچھ کھٹکا سا ہؤا اور مراد کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ٹلاجی پانی کے پیپوں سے ٹکراتے پھر رہے ہیں۔ ایک خالی پیپا لوٹ جانے کی آواز تھی جس نے اُسے جگا دیا تھا۔ اس نے اپنا جوتا اُٹھا کر گدھے کی طرف پھینکا۔ اور یہ کہہ کر پھر سو گیا کہ معلوم ہوتا ہے سراج نے ٹلاجی کو آج کافی پانی نہیں پلایا۔

صبح ہوتے ہی وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہؤا پیپوں کی طرف گیا تاکہ باقی پانی کی مقدار کا صحیح اندازہ کر سکے۔ کچھ خالی پیپوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر جب اُس جگہ پہنچا جہاں بھرا ہؤا پیپا رکھا تھا تو یکلخت اس پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ پیپا اوندھا پڑا تھا۔ گو اس کے نیچے کی ریت میں ابھی نمی باقی تھی۔

تھوڑی دیر میں سراج بھی آیا اور چپ چاپ مُراد کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے چہرے زرد تھے اور زبانیں بند۔ بعض اوقات گفتگو کی نسبت خاموشی سے زیادہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

چند منٹ میں ایک دو تھی اور چند تسموں سے زین بنا کر گدھے کی پشت پر کس دی گئی۔ یہ لمحے دُنیا بھر کی سونے کی کانوں سے زیادہ قیمتی تھے کیونکہ ایک ایک لمحے پر کسی جان کے ضائع ہو جانے یا بچ جانے کا انحصار تھا۔ صرف مراد اور سراج کی دو سفری بوتلوں میں پانی تھا اور تقریباً سو میل کا فاصلہ۔ لڑکی کو جگا کر گدھے پر بٹھا دیا گیا۔ مُراد آگے آگے ہو لیا۔ اس کے بعد گدھا اور لڑکی اور آخر میں سراج۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ صحرا کی تپتی ہوئی ریت کے بے پایاں سمندر کو عبور کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

صبح کے آثار افق پر نمودار ہو رہے تھے اور سامنے حد نظر تک صحرا کی ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ دونوں آدمیوں نے کوٹ پہن رکھے تھے لیکن دو تین میل جانے کے بعد مُراد نے کوٹ اُتار کر راستے میں ریت میں ڈال دیا۔ سراج نے اپنا کوٹ اس پر رکھ دیا۔ لڑکی کی واسکٹ بھی اُتار کر چھوڑ دی گئی کیونکہ جس قدر وزن کم ہو سکے غنیمت تھا۔

دوپہر ہونے کو آئی۔ اُنہوں نے لڑکی کو کچھ خشک چھوہارے کھانے کو دیئے اور پانی کے بھی ایک دو گھونٹ پلائے، وہ رونے لگی "مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ اور پانی پیوں گی"۔ مراد نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

"اب ہمت کرنے کی ضرورت ہے بیٹی۔ اور صبر کی۔ اگر اب پانی پی لوگی تو جب اس کی زیادہ ضرورت ہوگی پانی نہیں ملے گا۔ یہ صحرا ہے بیٹی صبر کرو"۔

اس نے حوصلہ کر کے اپنے آنسوؤں کو روک لیا۔ اور وہ پھر روانہ ہو گئے۔ ہر گھنٹے کے بعد صرف چند منٹ کے لئے رُک جاتے اور پھر چل دیتے۔ دونوں نے گذشتہ رات کے بعد ایک قطرہ پانی نہیں پیا تھا۔ سہ پہر کے وقت انہیں صحیح معنوں میں تکلیف ہونا شروع ہو گئی اور قدم ڈگمگانے لگے کیونکہ سخت پیاس کے پہلے چند گھنٹے ہی سب سے زیادہ کرب انگیز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دماغ پر خشکی کا اثر ہونا شروع ہوتا ہے اور غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ لڑکی کو کبھی کبھی چند قطرے پانی کے دے دیئے جاتے تھے۔ وہ روتی تھی اور خود بخود خاموش ہو جاتی تھی۔

شام ہو گئی اور وہ اب بھی نہیں ٹھہرے۔ گرمی سے بچاؤ کے یہی چند گھنٹے تھے اور ان ہی پر سب کی زندگی کا دارومدار تھا۔ دماغوں میں خیالات بکھرنا شروع ہو گئے تھے اور احساس لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت مجبوراً کچھ دیر کے لئے رُک جانے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ اب سکت باقی نہیں رہی تھی۔ لڑکی مدت سے تسموں سے بندھی ہوئی سو گئی تھی اور سراج نے اسے بازو کا سہارا دے رکھا تھا۔ اُنہوں نے اسے کھول کر ریت پر لٹا دیا اور خود لیٹے گیا، جہاں کھڑے تھے وہیں زمین پر گر گئے۔

"ایک گھنٹہ" مراد نے آہستہ سے کہا۔ سراج نے ایک آہ کے ساتھ جواب دیا "ہاں!" ان کی آوازیں بھاری ہو گئی تھیں اور پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ غنیمت تھا کہ چہروں کی حالت اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

گھنٹہ بھر میں وہ اُٹھ کر پھر روانہ ہو گئے۔ لڑکی کو گدھے پر بٹھا کر اس کی ٹانگوں اور کمر کو رسی سے باندھ دیا گیا تاکہ ضعف سے گر نہ پڑے۔ سراج نے کہا "ابھی اس کی کیا ضرورت ہے؟" تو مراد کہنے لگا کہ یہی وقت ہے کچھ پتہ نہیں کب ہماری طاقت بالکل جواب دے جائے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو سراج نے اپنا ہاتھ مراد سے ملانے کے لئے بڑھایا اور کہا "تم واقعی سمجھدار ہو اور مجھ سے بہت زیادہ دور اندیش مراد۔ یہ بات میں مدت سے جانتا ہوں گو کبھی زبان پر نہیں لایا"۔ مراد مسکرایا اور آہستہ سے کہنے لگا "تمہارا حوصلہ قابلِ رشک ہے سراج۔ اور تمہارے جیسا دوست ملنا محال ہے"۔

سورج کا غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ مشرق سے نمودار ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں صحرا پر آگ برسنے لگی۔ جب چٹانیں گرمی سے

فضا میں تیرتی ہوئی نظر آنے لگیں اور بخارات کی لہروں نے ان کے چاروں طرف موت کا ناچ شروع کر دیا تو اُنہوں نے پہلی مرتبہ اپنے ہونٹ پانی سے تر کیئے۔

مُراد نے کہا "میرے خیال میں اب ہمیں ایک ایک گھونٹ پی لینا چاہیئے۔ کیوں سراج؟"

سراج نے جواب دیا "نہیں (گو پانی کے خیال سے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی) ہر ایک قطرہ جو ہمارے منہ میں جائے گا اس سے لڑکی کے زندہ رہنے کی اُمید کم ہوتی جائے گی۔"

مراد کچھ عرصے تک چپ چاپ قدم اُٹھاتا رہا اور اس دیوانگی کے آثار کو ضبط کیئے رہا جس سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ آخرکار آہستہ سے کہنے لگا "میری رائے اس کے خلاف ہے سراج۔ اگر ہم سہ پہر تک ساتھ نہ رہ سکے اور جہاں دوراستے ہوجاتے ہیں وہاں گدھے کو درست راستے پر نہ ڈال سکے تو ممکن ہے وہ گھوم کر پھر صحرا میں سونا نکالنے والوں کے خیموں کی طرف مُڑ جائے۔ اس لیئے جس طرح بھی ہوسکے اس موڑ تک ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔"

اس نے بوتل کا ڈھکنا الگ کرکے بوتل سراج کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس نے ہونٹوں کی پپڑیوں کو ترکرکے واپس کی تو مراد نے بھی اپنے ہونٹ تر کر لیئے۔

سہ پہر ہونے تک وہ اپنے اردگرد صحرا کی ہستی سے تقریباً بے خبر ہو چکے تھے اور مُنہ سے بات نہ کر سکتے تھے۔ ان کی خشک زبانوں اور سُوجے ہوئے ہونٹوں سے الفاظ نہیں بنتے تھے۔ وہ اس طرح چلے جارہے تھے جس طرح کوئی خواب میں ہوتا ہے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے انہیں محسوس نہ ہوتے تھے اور اگر احساس تھا تو صرف اس قدر کہ گدھا راستے سے الگ نہ ہو۔ اس کے بعد مراد خود بخود اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا گو آواز نہ نکلتی تھی۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ دماغ انگاروں سے بھرا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اور قدم ڈگمگانے لگے۔ آخرکار لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل ہوکر زمین پر گر گیا۔

سراج ٹھہر گیا۔ اس کے قریب آیا اور خشک ہونٹوں کو خشک زبان سے تر کرکے بڑی مشکل سے بولا "کیوں مراد؟"

مُراد نے آنکھیں کھولیں اور جواب دیا "بس سراج۔ لڑکی کو پہنچا دینا۔ خدا حافظ!" سراج نے جھک کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور کہا "تم بڑی بہادری سے جان دے رہے ہو مراد۔ تم سا دوسرا کوئی نہ ہوگا۔" وہ گدھے کو پکڑ کر مُراد کے قریب لے آیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن طاقت نہ تھی۔ آخر نہایت دقت سے ہاتھوں کے سہارے بیٹھ گیا اور لڑکی کے ہاتھ کو جو اس طرف لٹک رہا تھا۔ بوسہ دیا۔ دو مرتبہ۔ لڑکی نے اپنا ننھا سا گال اس کے گرد آلود بالوں سے لگا دیا۔ اور وہ اسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

جہاں سے دوراستے ہوجاتے تھے ابھی وہ جگہ چار میل کے فاصلہ پر تھی اور سراج جانتا تھا کہ اگر لڑکی کی جان بچانا ہے تو وہاں تک اس کا پہنچنا لازمی ہے۔ اس کے بعد گو قصبہ ابھی اور پانچ میل کے فاصلہ پر تھا تاہم گدھے کے سیدھا راستہ چھوڑ دینے کا احتمال نہ تھا۔ اُس کے لیئے ہر قدم اُٹھانا جانکنی کے برابر تھا۔ وہ ایک ایک فٹ اور ایک ایک انچ کرکے راستہ طے کر رہا تھا۔ ایک میل ـــ دو میل ـــ تیسرا میل

بھی گزر گیا ۔ اب صرف ایک میل باقی تھا اور اس کے جسم میں طاقت نہ رہی تھی صرف قوتِ ارادی تھی جو لئے جا رہی تھی۔ قدم لڑکھڑاتے ہوئے پڑتے تھے۔ وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھٹنوں کے بل گر جاتا لیکن گدھے کے سہارے اُٹھتا اور آگے کو روانہ ہو جاتا ۔۔۔۔۔ راستے کا موڑ دکھائی دینے لگا۔ اس نے ٹھوکر کھائی اور اوندھے مُنہ گرا۔ اب کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس نے پانی کی چھاگل میں سے ایک گھونٹ پیا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلنے لگا۔

موڑ آیا اور گزر گیا۔ گدھا درست راستے پر جا رہا تھا۔ سراج نے گھٹنوں پر کھڑے ہو کر لڑکی سے کہا "ایک ایک قطرے سے زیادہ کبھی مت پینا۔ تمہاری زندگی اسی میں ہے۔ لو اب خدا حافظ !" گدھے کی پشت پر ہاتھ سے تھپکی دے کر اسے چلا دیا۔ اور اب چونکہ آنکھوں سے بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا جلتی ہوئی ریت پر لیٹ گیا۔

وہ دونوں خچر جن کو چند دن پہلے سراج اور مراد نے گاڑی سے کھول کر صحرا میں چھوڑ دیا تھا بھٹکتے ٹکریں کھاتے بھوکے پیاسے آخر کار قصبے میں پہنچ گئے تھے اور چند آدمی ایک چھکڑے پر پانی کے برتن لاد کر لڑکی اور اس کے بڈھے چچا کی تلاش میں روانہ ہو گئے تھے۔ دور سے اُن کو وہ گدھا اور لڑکی نظر آئے اور گو وہ بہت حیران ہوئے اور لڑکی بھی انہیں کچھ سمجھا نہ سکی تاہم انہیں ساتھ لے کر واپس ہوئی اور اس کے دونوں بچانے والوں کو بیہوشی کی حالت میں اُٹھا کر چھکڑے میں لٹا دیا گیا۔

ہسپتال میں دو پلنگ برابر برابر لگے ہوئے تھے۔ سراج کچھ عرصے سے جاگ رہا تھا۔ مُراد نے کروٹ لی۔ آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر حیرانی سے دیکھا۔ سراج نے پکار کر کہا "ارے سستی کے پلندے۔ اُٹھیگا بھی یا نرم نرم سفید بستر دیکھ کر تمام عمر سوتے ہی رہنے کا ارادہ ہے"!

مراد نے تھکے ہوئے خمار آلود انداز میں کہا "بک بک مت کر" اور کروٹ لے کر پھر سونے کی تیاری کرنے لگا لیکن سراج کے پلنگ سے ایک تکیہ بڑے زور سے اس کے سر پر آ لگا اور آواز آئی "ارے بڈھے کھوسٹ۔ اب اُٹھ اور کان لگا کر میری بات سُن۔ لڑکی کا باپ یہاں آ رہا تھا لیکن راستے میں رُک گیا تو لڑکی اپنے چچا کے ساتھ اُس سے ملنے کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ راستہ بھُول کر وہ ہمارے ڈیرے کی طرف جا نکلے۔ وہ بڑا امیر آدمی ہے، ابھی یہاں آیا تھا اور کہتا تھا کہ جہاں ہم سونا نکالتے ہیں اور جہاں ہم نے اس کی لڑکی کے نام پر بھی زمین پر قبضہ کر لیا ہے اس جگہ وہ کارخانہ کھول دے گا اور ہم اس کے حصّہ دار ہوں گے ۔۔۔ حصہ دار ۔۔۔ ہوش آیا اب؛ لڑکی اور مُلاّجی ہمارے پاس رہیں گے۔ اور تنہائی کی راتیں اب کبھی نہ آئیں گی ۔۔۔۔"

مراد نے کہا "تم بڑے بدتمیز ہو!" اور اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

عطاء الرحمٰن

سمے[1] کی پکار!

بھوک کے مارے ہند کے پیارے
تو بھی ہے اِس دُنیا کے اندر

تُو بھی خدا کی زمیں پہ بسا ہے
تجھ کو بھی چاہئے خود اپنا گھر!

سامنے اپنے حقوق کے اَڑ جا —————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

رزق پہ تیرے یہ پہرہ کیسا
کیوں نہیں راحت تجھ کو میسّر

ہے یہ سمے کا تقاضا تجھ سے
کیوں نہیں سب کی طرح تُو خود سَر

دُور ہے کیوں تُو اپنی خودی سے —————— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

اپنے وقار کے بَل پہ کھڑا ہو
سب کو دکھا دے ضبط کے جوہر

کھَول رہا ہے خون بدن میں
جی کو سنبھال لے دل کو قوی کر

سامنے عزم کے سُن نہ کسی کی —————— اپنی کہے جا مَوت سے مت ڈر!

دیکھ قدم تھرّائیں نہ تیرے
عزم ہے تیرا جان سے بڑھ کر

اب تو سمے کی پکار یہی ہے
خود ہی خدا[2] بن خود ہی پیمبر

سُن نہ کسی کی اپنی کہے جا —————— دل کو قوی کر مَوت سے مت ڈر!

---

[1] سمے معنی وقت ۔ [2] خدا اور پیمبر سے مطلب ذاتِ وحدہٗ لاشریک اور انبیاء مرسلین نہیں بلکہ مُوجد و مُقلد کے جیسے "خدائے سخن" ——— "در شعر سہ کس پیمبرانند" وغیرہ جملوں میں۔

خوف کے بادل گھور رہے ہیں   جیسے بھیانک بھوت ڈرائیں
ضبط کی آنکھ سے دیکھ لے تو گر   ہو کے غبار ہوا ہو جائیں
دیکھ جھجک نہ ذرا بھی کسی سے —— دِل کو قوی کر موت سے مت ڈر

توپ کے گولے بم کے دھماکے   اپنی ہی موت کے آپ نشاں ہیں
جسم تو جسم سے ٹوٹ سکے گا   رُوح کے آگے سب یہ دُھواں ہیں
جی کے مرے اور مر کے جئے تو —— ضبط سے کام لے موت سے مت ڈر!

پھونک دے صور، بگل کو بجا دے   جیتے ہوئے مُردوں کو جِلا دے
نام گھمنڈ کا جگ سے مٹا دے   خاک میں دھن کے دھڑلّے[1] مِلا دے
توڑ دے ظلم کی زنجیروں کو —— دِل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

آنکھ نہ پھیر حقوق سے اپنے   چھوٹنا حق سے ہی جی سے گزرنا
بل پہ اسی کے ہے قوم بھی قائم   خودکشی خود ہی نہ چاہیئے کرنا
بھوک کے مارے ہند کے پیارے —— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

تجھ کو قسم ست تتو[2] کی ہندو!   جوش میں لا پھر شکتی ساگر
تجھ کو قسم توحید کی مسلم!   قوم میں وحدت پھر سے بپا کر
ضبط سے کام لے، صدق پہ اَڑ جا —— دل کو قوی کر موت سے مت ڈر!

سید مقبول حسین احمدپوری

[1] دھڑلّے معنی قہقہے۔ من کی ترنگیں۔ رنگ رلیاں وغیرہ۔
[2] ست تتو معنی سچ، حقیقت۔ جوہرِ صدق۔ ذاتِ مطلق۔ الله رحمٰن۔

غالبؔ اور بیدلؔ

غالب کے بہت ابتدائی اشعار عام طور پر بے اعتنائی سے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا شاعرانہ پایہ بلند نہیں ہے اس لئے غالب کے تمام نقادوں میں سے کسی نے بھی شاعر کے کلام کے اس حصے کو تفصیل کے ساتھ معرض بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔ دراصل غالب کے ذہنی ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے کے لئے عہدِ طفلی کا کلام اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محض یہ حقیقت مختصر طور پر بیان کر دینا کہ "شروع شروع میں مرزا غالب نے بیدل کے انداز کی تقلید کی" غالب کی اولیں اور پرجوش شاعرانہ عقیدت کی شرح کا حق ادا نہیں کرتا۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اس موضوع پر ذیل میں بوضاحت بحث کی ہے۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ غالب نے دس سال کی عمر میں میر کے بجائے بیدل کو اپنا رُوحانی اُستاد کیوں اور کس طرح بنایا۔ بیدل کے انداز کی خصوصیات کیا ہیں اور یہ خصوصیات کس حد تک غالب کے ابتدائی کلام میں منعکس ہوئی ہیں۔ نیز معنوی طور پر غالب اور بیدل میں کیا اشتراک و امتیاز ہے۔ یہ بحث دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں (جو اس مہینے شائع کیا جا رہا ہے) غالب کے عہدِ طفلی کے اشعار اور بیدل کے عام اندازِ کلام کے صوری عناصر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ جو فروری کے "ہمایوں" میں شائع ہوگا، غالب و بیدل کے معنوی اتحاد و اختلاف کی تشریح کرے گا۔ ناظرین اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھیں کہ مقالہ ذیل میں غالب کے کلام کا وہ نہایت ابتدائی حصہ زیر بحث ہے جسے عام طور پر "مہملات" کا نام دیا جاتا ہے۔ سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے غالب نے بیدل کی تقلید ترک کر دی تھی اس لئے غالب کا پختہ کلام اس مقالے میں ایک حد تک خارج از بحث ہے۔

حامد علی خاں

اورنگ زیب عالمگیر کا سالِ وفات جس طرح ہندوستان میں اسلام کی سیاسی طاقت کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اسی طرح فارسی زبان بھی مسلمانوں کی مسلمہ ادبی زبان کی حیثیت سے دراصل عالمگیر کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ عوام نے تو غالباً شاہ جہاں کے عہد ہی سے روزمرہ کی بات چیت میں اُردو (یا اس زمانے کی اصطلاح کے مطابق "ہندی") کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن کم از کم ۱۷۰۷ء تک بادشاہ اور عمائد دربار یقیناً فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد بادشاہ و اُمراء نے بلا تکلف اُردو میں گفتگو کرنے کی طرح ڈال دی۔ سب سے پہلے شاید محمد شاہ "رنگیلے" نے اس "غیر سرکاری" طریقے پر اُردو کی سرپرستی شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت اور اس کے نواح میں اُردو شاعری کا آغاز محمد شاہ کے عہد سے ہوا چنانچہ ولی نے دکن سے آکر چند ہی سال میں اپنے "ریختے" یعنی "ہندی" غزل گوئی سے دلی کو مسخر کر لیا ع

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہے کوئی محمد شاہ سوں

جب دربار میں اس نئی شاعری کی قدر افزائی ہوئی تو دلی کے گلی کوچوں نے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے پچاس سال بادشاہ کے زہد و تقشف کی وجہ سے غزل گوئی اور سخن سنجی کے لئے خاص طور پر ساز گار نہ تھے بعض روایات

سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل عالمگیر اچھے شعر سے لُطف اندوز ہونا اپنے لئے باعثِ عار نہ سمجھتا تھا تاہم اُس وقت بھی شعرو شاعری سے اُس کے ذوقِ عمل اور جوشِ تقویٰ کی بیزاری اس حد تک معروف ہوچکی تھی کہ اُس کے مقربینِ بارگاہ اس کے سامنے اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار اپنے لئے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اُس کے ایامِ شہزادگی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اثنائے شکار میں جب نوّاب عاقل خاں نے اپنا یہ شعر اُس کے سامنے پڑھا :۔

عشق چہ آساں نمود ، آہ چہ دشوار بود ہجر چہ دُشوار بُود ، یار چہ آساں گرفت !

اور عالمگیر نے اس شعر پر دیر تک وجد کرنے کے بعد پوچھا کہ کس کا شعر ہے ؛ تو عاقل خاں نے جواب دیا : " ایک ایسے شخص کا جو بندگانِ حضور کے سامنے شاعر کے نام سے موسوم نہیں ہونا چاہتا " تقریباً نصف صدی بعد جب صاحب " مرآۃ الخیال " نے عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں اپنا تذکرۂ شعرا مرتب کرنا شروع کیا تو دَورِ عالمگیری کے آغاز کی تصویر اِن دلچسپ الفاظ میں کھینچی :۔

" اُس کے درۂ عدل کی ہیبت سے حسینوں کا خالِ کافر کیش محرابِ ابرو میں مصروفِ نماز ہوگیا اور اس کے محکمۂ قضا کے دبدبے سے خوش جمالوں کے غمزۂ خوں ریز کو حجرۂ چشم میں چلّہ نشیں ہونا پڑا "

یہ چلّہ کشی پوری نصف صدی تک جاری رہی۔ آخر ۱۷۱۹ء میں اس پنجاہ سالہ سکوت وجمود کا ردِّعمل شروع ہوا " رنگیلے پیا " اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال بعد سریرآرائے سلطنت ہوئے اور اُنھوں نے گزشتہ نصف صدی کی قاعدہ شناسی اور اصُول نوازیوں کا طلسم خوب دل کھول کر توڑا۔ عوام نے قدرۃً بے حد جوش وخروش سے وَلی کی شاعری کا خیر مقدم کیا۔ ساٹھ ستّر سال کی پابندیٔ نظم وضبط کی وجہ سے ان کے جذبات اپنے اظہار کے لئے گھبرائے ہوئے تھے۔ وَلی ایک نہایت موزوں نفسیاتی موقع پر دلّی میں وارد ہوا اور اُس نے اُن کے بے تاب جذبات کے لئے ایک بے حد دلپذیر ذریعۂ اخراج مہیا کیا۔ نئی زبان کی شاعری جس سُرعت سے مقبول ہوئی اُس کی تہ میں یہی راز تھا اگرچہ اِس عہد کی فارسی شاعری کی روش بھی شاید ایک حد تک اس انقلاب کی ذمہ دار تھی۔ بہرحال ریختہ گوئی کی مقبولیت کی رفتار نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک اُردو کی حیثیت بہ لحاظ ایک ادبی زبان کے قطعی طور پر مسلّم ہوگئی۔

وَلی اور اُس کے مقلدین (ادبی حیثیت سے) گویا اُردو زبان کی تخلیق کر رہے تھے۔ اس لئے قدرۃً ان کی توجہ زبان کے مانجھنے اور اُردو میں فارسی کے مقابلے کے اسالیبِ اظہار فراہم کرنے پر بہت زیادہ منعطف تھی۔ زبان وبیان کو زیادہ اہمیت دینے کی یہ روایت میر وسودا کے توسط سے اُنیسویں صدی تک قائم رہی اور اس کا منطقی نتیجہ ذوق کی شاعری کی صُورت میں رُونما ہوا جس کی غزل میں حسنِ وصفائے بیان اور قصیدے میں شکوہِ الفاظ وقدرتِ کلام بجائے خود ایک قیمت رکھتے ہیں، خواہ ان کی تہ میں کتنا ہی کمزور خیال یا جذبہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے شاعر میر کا کمالِ فن یہ ہے کہ اس کے کلام میں جذبے اور اظہار کا نہایت لطیف توازن قائم ہے اور اس کے بہتر اشعار میں یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے ان دونوں میں سے کسی ایک کو غیر متناسب اہمیت دی ہے۔ جب اُنیسویں صدی کا آغاز ہوا تو فنِ ریختہ کے کہنہ سال اُستاد میر کے شاعرانہ کمال کے صدقے میں سادگی اور سلاست کے متعلق وَلی کی قائم کی ہوئی روایت اُردو

ادب کی دُنیا میں کامل طور پر تسلیم کی جا چکی تھی۔

اُردو شاعری کی اس نوخیز روایت کے ساتھ ساتھ ایک اور ادبی مسلک بھی موجود تھا جس کا اندازہ اُردو کی سلامت روی اور سلاست پسندی سے بُعدِ قطبین رکھتا تھا۔ یہ فارسی کے متاخرین شعراء کا مسلک تھا جس کے مطابق سخن آرائی میں تکلف آمیز نازک خیالی اور جدت طرازی معیارِ کمال سمجھی جاتی تھی۔ فارسی شاعری اب اپنے دورِ سادگی کو عرصہ ہوا، پیچھے چھوڑ چکی تھی اور گزشتہ صدی سے دراصل اپنے ضعف و زوال کی اُس منزل میں داخل ہو چکی تھی جسے مغربی فن کی اصطلاح میں "rococo" کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اس کیفیت کو "صنائع و بدائع" سے تعبیر کیا جائے تو شاید وہی مطلب ادا ہو سکے۔ ولی کے فارسی گو معاصرین میں مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی اس طرزِ شاعری کے سب سے بڑے اُستاد تھے۔

غالب کے متعلق سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ اُس کا سلسلۂ نسب براہِ راست فارسی گو شعرا سے ملتا ہے۔ ولی اور میر کی نسل سے، کم از کم اپنے پہلے دَور میں، اُسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس کے ابتدائی اشعار دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ میر کے نام کا بھی کوئی شخص ہو گزرا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں فارسی اور ہندوستانی ادب کے درمیان جو خلیج قائم کی گئی تھی اور جسے اسی نوے سال کی شاعرانہ کاوشوں نے ناقابلِ عبور حد تک وسیع کر دیا تھا، غالب اپنے ظہور کے ساتھ ہی بلا تکلف اُسے پاٹنے کی فکر میں مصروف نظر آتا ہے اورنگ زیب کی وفات کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۸۰۷ء میں، وہ ایک صدی کی اُلٹی زقند لگا کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں عہدِ اورنگ زیب کے حصۂ آخر کے شعراء کھڑے تھے۔ ریختہ گو شعراء نے فارسی سے کٹ کر جو الگ راہ نکالی تھی اُس پر چلنے کا خیال تک اُسے نہیں آتا۔ وہ اُردو میں شعر لکھتا ہے مگر اُردو اور فارسی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ دراصل محمد شاہی دَور کے بعد پہلی مرتبہ اُردو کے ایک شاعر نے یہ کوشش کی کہ ریختے کی ایک صدی کو فراموش کر کے براہِ راست فارسی سے رشتہ جوڑنے کا ڈھنگ نکالے اور ریختہ گو شعرا کی روایات سے قطع نظر کر کے فارسی شعراء کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بارور ہونا ممکن نہ تھا اور اس کا اقدام کوئی ناتجربہ کار اور بے حد پرجوش نوجوان ہی کر سکتا تھا۔ وہ شاعرانہ روایت جو ایک سو سال کی سخن پردازیوں کا ماحصل تھی، ایک طفلِ ناآزمودہ کار کی مدعیانہ للکار کو خاموشی سے نہیں سُن سکتی تھی، چنانچہ غالباً ۱۸۱۵ء میں[1] نپولین کی طرح غالب نے بھی اپنے اس واٹرلو کے معرکے میں فیصلہ کُن شکست کھائی اور اپنی شاعرانہ روش بڑی حد تک بدل ڈالی، لیکن اس شکست کے باوجود نوجوان شاعر کا سرِ غرور اُردو کے سامنے بالکل جُھک نہیں گیا۔ فارسی سے جو گہری رُوحانی مناسبت اُس کو تھی وہ اپنے اظہار کے لئے مضطرب رہی جس کے باعث وہ اور پانچ چھ برس تک مختلف اطراف و جوانب میں اپنے نقادوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اِس مدت کے خاتمے پر (یعنی ۱۸۲۱ء کے قریب) روز روز کی اس چپقلش سے تنگ آ کر اُس نے اپنی عنانِ تخیل ریختہ گوئی کے میدان سے ایک حقارت آمیز انداز کے ساتھ بظاہر ہمیشہ کے لئے پھیر لی۔ یہ عزم آخر تک قائم نہ رہ سکا۔ تقریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۵۰ء میں، دربار بہادر شاہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانے پر غالب نے دوبارہ اُردو میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں وہی تبدیل شدہ انداز جاری رکھا جو

---

[1] غالب کی شاعری کے پہلے اور دوسرے دَور کی تاریخوں کے تعین کے متعلق مجھے ڈاکٹر سید عبداللطیف اور شیخ محمد اکرام سے شدید اختلاف ہے مگر اس کی شرح جو بہت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے میں کسی اور موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

ابتدا ۱۸۱۵ء کے قریب اختیار کیا تھا تاہم یہ تغیر اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا، نہ ہو ہی سکتا تھا کہ دورِ اوّل کی باتیں ایک فراموش شدہ کہانی بن جاتیں۔ اُردو زبان کی روایات اب غالب کے نزدیک قابلِ احترام ضرور تھیں مگر فارسی سے غالب کے گہرے لگاؤ کا احساس ہمیشہ ان کے ساتھ شامل رہا۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی فارسی کی طرف غالب کی بازگشت رائگاں نہیں گئی۔ اٹھارویں صدی میں جس سُرعت کے ساتھ فارسی ہمارے احساس و تخیل کی سرزمین سے نابود ہورہی تھی، اس کو روک دینا غالب ہی کے زبردست ہاتھ کا کام تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ولی، میر، ذوق اور داغ کا سلسلہ غالب کے ظہور سے برہم نہ ہوتا تو ہمارے عہد کا اُردو ادب اپنے موجودہ انداز سے بہت کچھ مختلف ہوتا۔

الغرض غالب کی پہلے دَور کی اُردو شاعری کے مطالعے میں شروع ہی سے یہ قرار دے لینا چاہئے کہ ہم درحقیقت فارسی شاعری کی ایک خاص شکل کا مطالعہ کررہے ہیں۔ اس دَور کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ہندی کا ایک بھی لفظ شامل نہیں ہوتا مثلاً ؎

اسد خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام   مشکل آساں کُن یک خلق! تغافل تاچند؟

لیکن جن اشعار میں ہندی کا کوئی لفظ اتفاق سے آبھی جاتا ہے، اُن میں بہت سے ایسے ہیں جن میں فارسیت کی رُوح درحقیقت پہلی قسم کے اشعار سے بہت زیادہ حلول کئے ہوئے ہے۔ مثلاً مندرجۂ بالا شعر کو تو اُردو شاید قبول کرنے پر تیار ہو بھی جائے مگر ذیل کے مشہور شعر کو اُردو زبان کا نام دینا بہت بڑا تجاوز معلوم ہوتا ہے ؎

شمارِ سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا   تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دِل پسند آیا

یا یہ شعر دیکھئے ؎

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل   یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ بالِ تیر ہے

صرف یہی نہیں کہ ان اشعار کے صُوری عناصر کی تعمیر فارسی زبان نے کی ہے بلکہ جس طرزِ تخیل پر ان کی بنیاد قائم ہے وہ انہیں میر اور اُس کے مقلدین کے بجائے دورِ عالمگیری کے فارسی شعرا کی روایت سے براہِ راست وابستہ کردیتا ہے۔ ان شعرا میں بیدل عظیم آبادی سب سے زیادہ ممتاز تھا چنانچہ مرزا غالب نے لڑکپن میں اسیر و شوکت کے علاوہ بیدل کے مطالعے اور تقلید پر خصوصیت سے زور دیا۔ اس کی سند کے طور پر خود غالب کا بیان مکاتیب میں موجود ہے اور تقریباً تمام نقادوں کو جن میں حالی اور شبلی جیسے مشاہیر بھی شامل ہیں، اس سے اتفاق ہے کہ ابتدائی دَور میں غالب کے نزدیک بیدل کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی شاعری کی معراجِ کمال تھی ؎

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بہ کف اسد   یک نیستاں قلمرو اعجاز ہے مجھے

جہاں تک مجھے علم ہے، صرف مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں اس حقیقت سے ایک حد تک اختلاف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"وہ (یعنی مرزا غالب) بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن نہ دماغی قویٰ نے بلوغ حاصل کیا تھا، نہ اندازِ بیان پر پوری قدرت و دستگاہ حاصل ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے، جس طرح آج کل کے بعض فرومایہ اور

کور ذوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے . . . . ."

لڑکپن میں مرزا غالب کے تخیل اور قوتِ بیان کی ناپختگی بہر نوع مسلّم ہے لیکن دورِ اوّل میں بیدل کے ساتھ ان کی مماثلت اتنی سطحی اور اتفاقی بھی نہیں ہے جتنی عبارت مافوق کے حصۂ آخر سے مترشح ہوتی ہے۔ میری رائے میں تخیل کے ایک بنیادی عنصر کا اشتراک اس امر کا باعث ہوا کہ شروع ہی میں (میر کے بجائے) بیدل کے کلام نے غالب کو اپنی طرف کھینچا۔ تحلیل وتجزیہ غالب کے تخیل کا ایک ایسا مستقل لازمہ ہے کہ بیدل کے خاص اسلوبِ بیان کی تقلید ترک کردینے کے بعد بھی اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جس حد تک شعر کی محض فنی کیفیتوں (مثلاً انتخاب ونشستِ الفاظ اور تشبیہ واستعارہ کی ساخت) کا تعلق ہے غالب کے ابتدائی اشعار اور بیدل کے کلام کے ایک بہت بڑے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مشابہت کی شرح میں یہاں کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔

دُنیا میں شاید کسی قوم کا ادب ایسا نہیں جس کا آغاز نظم سے نہ ہوا ہو اور یہ نظم ابتداءً سادگیٔ خیال سے ممتاز نہ رہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں شاعر کو کسی جذبے یا خیال کے تجزیے سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے واضح اور نمایاں پہلو کو بحیثیت ایک غیر منقسم کُل کے دیکھتا ہے اور الفاظ میں اسی کی تعبیر کردیتا ہے۔ ادب کے ارتقا کے ساتھ تخیل کی یہ ترکیبی[1] کیفیت گھٹنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ نثر پیدا ہوجاتی ہے جو تحلیل وتجزیہ کا مخصوص ذریعۂ اظہار ہے اور خود شعرا کی نگاہ بھی اشیا و واردات اور جذبات وخیالات کے عقلی پہلوؤں پر زیادہ اٹھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس دور میں بدیہی حقائق کے بجائے نکات کے بیان پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ سعدی وحافظ اور عرفی وغالب کی غزلیات میں ترکیبی اسلوبِ بیان کا عروج وزوال بڑی خوبی سے نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ مولانا حالی نے مقدمۂ دیوان میں سعدی، حافظ اور غالب کا ایک ایک شعر دیا ہے۔ تینوں شاعروں نے مصیبت وابتلا کی تصویر ایک بحری تشبیہ کے ذریعے کھینچی ہے لیکن تینوں تحلیل وتجزیہ کے عنصر میں بتدریج اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں:۔

سعدی

ازورطۂ ما خبر ندارد — آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

حافظ

شبِ تاریک وبیمِ موج وگردابے چنیں حائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

غالب

ہوا مخالف وشب تار وبحر طوفاں خیز — گسستہ لنگرِ کشتی وناخدا خفت است

فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں تخیل کی ترکیبی ہیئت نہایت وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً رودکی کا جو مشہور قصیدہ امیر

---

[1] "ترکیبی" کے بجائے شاید لفظ "بدیہی" کا استعمال بھی ممکن تھا مگر بدیہی میں جو شائبۂ استخفاف پایا جاتا ہے اس کو ترکیبی شاعری سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جس طرزِ بیان کو ہم سادہ، یا بدیہی کہتے ہیں اس میں حقیقۃً ذہنی طور پر ترکیب کا عمل واقع ہوتا ہے لیکن یہ عمل غالباً وجدانی ہے ارادی نہیں۔

نصرالدین سامانی کی مدح میں ہے، اُس کو وہ یوں شروع کرتا ہے ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی ۔۔۔ یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

اے بخارا! شاد باش و شاد زی ۔۔۔ میر روزے شادماں آید ہمی

* * * * * * * *

میر ماہ است و بخارا آسماں ۔۔۔ ماہ سوئے آسماں آید ہمی

میر سرو است و بخارا بوستاں ۔۔۔ سرو سوئے بوستاں آید ہمی

شروع کے دو شعروں میں تزئین و تشریح کے بغیر اصل واقعے کو بیان کر دیا ہے اور حسنِ کلام کا مدار اظہار کی صداقت و برجستگی پر رکھا ہے باقی دو شعروں میں آسمان اور باغ دونوں ایسی ظاہر و باہر چیزیں ہیں اور چاند اور سرو کے ساتھ ان کا تعلق اس قدر کھلا ہوا ہے کہ شاعر کے مضمون سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمارا ذہن تحلیل و تجزیہ کی کسی منزل سے نہیں گزرتا۔ رودکی کے بعد سعدی و حافظ تک شاعرانہ تخیل کی یہ ترکیبی کیفیت قائم رہی۔ یہ دونوں کسی واقعے یا جذبے کے محض واضح اور روشن پہلو کا پُراثر بیان کر دیتے ہیں اور اگر اس سے بڑھتے ہیں تو اپنے موضوع کے ساتھ کسی مانوس حقیقت کو مشابہ قرار دے کر سیدھی سادی تشبیہ کے ذریعے سے اپنے بیان میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ سعدی کے دو مشہور شعر ہیں ؎

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در بازار ۔۔۔ وقتِ آن نیست کہ در خانہ نشینی بے کار

بلبلاں وقتِ گُل آمد کہ بنالند از شوق ۔۔۔ نہ کم از بلبلِ مستی تو بنال اے ہشیار!

یہاں ہمارے لئے ایک خاص صورتِ حال نہایت دلنشیں پیرائے میں مگر بغیر کسی قسم کی حاشیہ آرائی اور موشگافی کے بیان کر دی گئی ہے۔ اسی طرح سعدی کی غزل میں تشبیہات کا لطف دیکھئے ؎

بر بود دلم در چمنے سرو روانے ۔۔۔ زرّیں کمرے، سیم برے، موئے میانے

خورشید وشے، ماہ رُخے، زہرہ جبینے ۔۔۔ یاقوت لبے، سنگ دلے، تنگ دہانے

ذرا سا غور کرنے پر معلوم ہو جائے گا کہ ان اشعار میں شاعر کے مشاہدے نے خورشید و ماہ اور یاقوت و سنگ کو بحیثیتِ مجموعی لے لیا ہے۔ ہر چیز اس کے لئے ایک سالم اور مستقل وجود ہے۔ اس نے ان چیزوں کو ان کے اجزا و عناصرِ ترکیبی میں تقسیم نہیں کیا، نہ ان کے مشابہ امکانی علائق کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا ہے مثلاً یہ نہیں کہا کہ طلوعِ خورشید سے کسی مایوس شب زندہ دار کے دل کو جو کیفیتِ تسکین و اطمینان میسّر ہوتی ہے، وہی دیدارِ محبوب سے مجھے حاصل ہو جاتی ہے۔

حافظ میں دورِ تحلیل کے آغاز کی جھلک کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے تاہم اس کا بھی یہ خاص فن ہے کہ واقعات کو بالعموم من حیث واقعات ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور شعر کی تاثیر کے لئے واقعے کے باریک تر پہلوؤں کی تصویر کشی پر انحصار نہیں کرتا ؎

حافظ خلوت نشیں دوش بہ مے خانہ شد از سرِ پیماں گزشت بر سرِ پیمانہ شد

ہزار جہد بکردم کہ یارِ من باشی قرار بخش دلِ بے قرارِ من باشی

اس کے برعکس تحلیلی انداز میں جسے عام طور پر "نازک خیالی" کا نام دیا جاتا ہے، شاعر کو واردات وجذبات کی مرکب ہیئت سے بحث نہیں ہوتی اس کی نگاہ کُل کے بجائے مختلف اجزاء اور لطیف ونازک پہلوؤں پر پڑتی ہے اور انہیں کے بیان کو وہ اپنا کمال سمجھتا ہے یہاں تک کہ اس منزل میں شاعر خود اپنی شخصیت کا بھی تجزیہ کر دیتا ہے اور وہاں عقل وجذبات کی کشمکش دیکھ کر اپنی مرکب وسالم شخصیت کو گویا مختلف اور متعدد شخصیتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مثلاً نظیری اپنے ایک بظاہر سیدھے سادھے شعر میں بھی اپنی روح کو دو قوتوں میں منقسم دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض مسائل کو جب میں عقل کے ذریعے سے حل کرنے لگتا ہوں تو ناکام رہتا ہوں لیکن وجدانِ عشق سے کام لیتا ہوں تو بہ آسانی منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ہوں ؎

چہ داند فہمِ کوتہ بال جولاں گاہِ شوقم را کہ او راہِ دگر رفتست ومن جائے دگر دارم

اس شعر کے مصرعہ ثانی سے ایک لطیف نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل ابھی کہیں راہ ہی میں بھٹک رہی ہے مگر عشق ایک مقامِ خاص پر فائز ہو چکا ہے۔ عرفی کا شعر ہے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا یکدم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

یہاں شاعر نے یہ نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر انسان اپنے معائب ذاتی سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو یہ لازم ہے کہ اپنی فطرت کا جائزہ ایک بدگمان محتسب کی حیثیت سے لے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ شاعر کو انسان کی طبعی خود پرستی کا احساس ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر علانیہ طور پر اس قسم کے احتساب کی کوشش کی گئی تو انسان کی ہمدردی نفس تاریک پہلوؤں کو عارضی طور پر پسِ پردہ رکھنے کے لئے فی الفور مستعد ہو جائے گی۔ اس لئے وہ لفظِ کمین کے استعمال سے ایک مزید نکتہ پیدا کرتا ہے کہ یہ احتساب ناگہاں اور بلا اطلاع ہونا چاہئے۔

غنی کشمیری کا کلام بھی اسی تحلیلی اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ مثلاً وہ حصولِ شہرت کے اسباب کا تجزیہ کر کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ شہرت طلبوں کے لئے ہنگامہ خیزی وغلغلہ اندازی ہی تنہا وسیلۂ کامرانی نہیں ہے بلکہ انتہائی عزلت پسندی بھی باعثِ اشتہار ہو سکتی ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را

یہاں تک ہم نے زیادہ تر فکر وخیال کی تحلیلی کیفیت سے بحث کی ہے لیکن اس کا اثر قدرتاً طرزِ بیان کی نوعیت اور تشبیہات واستعارات کے انداز پر بھی پڑتا ہے۔ سعدی کی تشبیہات کے بعد نظیری وعرفی اور غالب وبیدل کی تشبیہات دیکھیں تو ترکیبی اور تحلیلی تشبیہ کا فرق خوب واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً نظیری نے ایک شعر میں امید وبیم کی کشمکش اور تذبذب کی شرح ایک اعجاز نما تشبیہ کے ذریعے سے کی ہے۔ درحقیقت یہ تشبیہ نہیں، ایک متحرک تصویر ہے ؎

بباد ورہم از احوالِ خویش در گفتار کہ ابر در گزر و تخم در زمیں دارم

اسی طرح غالب نے حصولِ مراد کے طویل انتظار اور آخر کار قطعی مایوسی کی تصویر کو اپنے ایک نہایت پُر لطف مبالغے میں اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد   در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر!

بیدل کی تشبیہات وخیالات میں یہ تخلیلی انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً حیرت میں استفہام کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص طرزِ بیان میں آنکھ کو کان سے مشابہ قرار دیتا ہے ؎

حسرت کمینِ مژدۂ اصلیست حیرتم   چشمم بہم نیامدہ گوشِ فسانہ ایست

ایک نسبتہً صاف تشبیہ ہے ؎

مکش سر زپستی کہ آوازِ آب   ترقی بہ قدرِ تنزل کند

اِس تمام بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ "ترکیبی" اور "تخلیلی" شاعری میں کس نوعیت کا فرق قائم ہے تخیل کی یہ "تخلیلی" کیفیت اگرچہ تمدن کی ترقی الوازمِ معاشرت کی تدریجی نفاست وارتقا اور سرمایۂ علم وحکمت کے اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے لیکن اس کے برعکس تہذیب وتمدن اور طرزِ بُود وماند کی "تخلیلی" نفاستوں کے ساتھ ہی لازماً "تخلیلی" شاعری کا فروغ نہیں ہوتا۔ اس طرزِ بیان کا ظہور، تمدن کے ارتقا کے علاوہ ایک خاص شاعرانہ روایت کے ارتقا کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عہدِ مغلیہ کا تمدن ایک طرف تو سترھویں صدی کے شعرا سے اس قسم کے اشعار لکھوا چکا تھا ؎

تاک را سیراب کن اے ابرِ نیساں در بہار   قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود؟ (دانش)

آنہا کہ بہ عقل از تو نشاں می طلبیدند   پیراہنِ مہتاب نمودند کتاں را (فوجی)

از زباں صورت نہ بندد رازِ احوالِ درون   حلِ عقد موئے معنی شانہ کے داند کہ چیست (سوزی)

دلِ غم دیدۂ دارم مپرس از گردِ کلفتہا   صدا در کوہ چوں رگ ماندہ از سنگینیٔ آہش (ناصر علی)

شبِ عید از خیالِ ابرویت گر بر فلک بینم   بداغم ناخنِ گردوں خلد چوں نیشِ عقربہا (شائق)

نہ شد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی   نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

بہ غفلت ساخت دل تا وا رہد از غیرتِ امکاں   چہا می سوخت ایں آئینہ گرمی داشت بینائی (بیدل)

اور دوسری طرف اسی تمدن نے ریختہ گوئی کے آغاز میں ولی کی زبان سے کیفیتِ ذیل کے اشعار کہلوائے[1]:؎

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا   جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا

زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے   یہ زخم ترا خنجر و بھالاں سے کہوں گا

---

[1] یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بیدل کے دو اردو شعر جو بذریعہ تیرہم تک پہنچے ہیں اپنی گھلاوٹ اور اندازِ بیان کی صفائی کے لحاظ سے خود بیدل کے بجائے تیر کے بہترین انداز کی یاد دلاتے ہیں۔ مضمون فلسفیانہ ہے اور بیدل کے مخصوص فلسفہ "بے خودی" سے اسے بہت قریبی مشابہت ہے۔ پھر بھی بیدل کے فارسی انداز کی "بہاراایجادیاں" یہاں بالکل نظر نہیں آتیں۔ "چمنستانِ شعرا" میں یہ دونوں شعر بحوالہ تیر یوں مندرج ہیں ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں + اِس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

جب دل کی آستاں پر عشق آن کر پکارا + پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ریختے کا یہ "ترکیبی" انداز بیان انیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہا جب ناگہاں غالب نے اپنے بازوئے ناآزمودہ کی پوری قوت سے اس کی بیخ وبنیاد پر وار کیا اور فارسی کے دورِ آخر کی "تحلیلی" روایت کو ریختے کے دورِ اوّل کے ساتھ بہ جبر ملا دینا چاہا۔ حافظ کی طرح میر کے ترکیبی تخیل کے ساتھ بھی دورِ تحلیل کی سرحد آملی ہے لیکن بڑی حد تک وہ ولی کی قائم کردہ روایت کا پابند ہے۔ میر کی واقعہ نگاری کا نہایت صاف نمونہ یہ ہے ؎

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا مے خانے پر! | بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر

تشبیہ کا پاکیزہ ترین انداز یہ ہے ؎

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات! | کلی نے یہ سن کر تبسم کیا!

اس کے خلاف غالب شروع سے آخر تک اپنے اردو اشعار میں جا بجا اپنی "تحلیلی" مناسبت طبع کا ثبوت دیتا ہے ؎

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئنہ | طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے | تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا | میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو | ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

ان چاروں شعروں میں غالب کی عمر کے چار مختلف منازل کے مطابق اس کے تحلیلی تخیل کی تمام تدریجات نمایاں ہیں۔ لڑکپن کی ناپختہ کارانہ بیتابیِ اظہار، عنفوانِ شباب کی رنگینیِ جذبات، انتہائے بلوغ کے زمانے کی پختگیِ خیال اور آخر میں بڑھاپے سے کچھ پہلے کی مشاقانہ قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ تجزیہ و تحلیل کا انداز ہر جگہ قائم ہے لیکن جہاں بیدل کے تحلیلی طرزِ خیال کا موضوع فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں وہاں غالب فلسفہ و اخلاق کے علاوہ نفسیاتی نکات کو بھی اپنی جستجو کے میدان میں لے آتا ہے بلکہ نفسیاتی تجزیے سے آگے بڑھ کر کہیں کہیں تحلیلِ نفسی کی سرحد تک جا پہنچتا ہے چنانچہ مندرجہ بالا چار شعروں میں سے تیسرا شعر اس طرزِ خیال کی ایک مثال ہے۔

لیکن نفسیاتی تجزیہ یا نفسی تحلیل بہت بعد کی باتیں ہیں۔ دورِ اوّل کے کلام میں جب بیدل کی تقلید غالب کے لئے سرمایۂ نازش تھی نفسیاتی تجزیے کا صرف ایک دھندلا سا آغاز نظر آتا ہے۔ لڑکپن کے ان اشعار میں غالب کو زیادہ تر محض عینی (Concrete) واقعات کے تجزیے سے سروکار ہے۔ تحلیلِ جذبہ و خیال کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسے ابھی اور چند برس لینے ہیں۔ ابتدائی دور کے تحلیلی واقعات کا انداز یہ ہے ؎

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی | زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے

یہاں شاعر ہم آغوشیِ محبوب کو محبوب کی وہ بڑی سے بڑی نوازش قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے محبوب کے بدن کا روا‌ں روا‌ں بزبانِ حال اس کے دل کی کیفیت اس سے پوچھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے | تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے

مطلب یہ ہے کہ دورِ ساغر کی ایسی فراوانی ہو کہ ایک صراحیِ مے کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھلتی چلی جائے۔ نوبت یہاں تک

آسئے کہ بادہ کشوں کے نیچے پنبۂ مینا کا فرش ہوجائے۔ ایک اور جگہ زمین میں دبے ہوئے بیج کا تعلق تحت الارض خزانۂ آب کے ساتھ بڑی مُوشگافیوں کے بعد ثابت کیا ہے۔ پاتال کا یہ پانی رس رس کر اُوپر کی مٹی تک پہنچا ہُوا ہے اور دوسری طرف بیج نے اپنے ننھے ننھے ریشے اس طرح نیچے کو پھیلا رکھے ہیں جس طرح کسی نے کنویں میں ڈول ڈال رکھا ہو ؎

بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے   ریشے سے ہر تخم کا دَلو (ڈول) اندرونِ چاہ ہے

غالبؔ کے تخیل کی یہی تحلیلی کیفیت ہے جس کی وجہ سے اُسے بیدلؔ کے ساتھ ایک نسبتِ خداداد حاصل ہے۔ اُس کی شاعرانہ فطرت کے اسی عنصر نے میرؔ اور اُس کے مسلک کے شعراء سے قطع نظر کر کے ابتداءً بیدلؔ اور پھر ظہوریؔ نظیریؔ اور عرفیؔ وغیرہ کی طرف رجوع کیا۔ دَورِ اوّل کی جن غزلیات میں غالبؔ نے بیدلؔ کے ساتھ ایضاً اظہارِ عقیدت کیا ہے ان میں سے ایک میں بصراحت یہ بتایا ہے کہ مجھے بیدلؔ کی جدّت طرازیاں (یعنی تحلیلی نکتہ آفرینیاں) خصوصیت کے ساتھ مرغوب ہیں ؎

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے   مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

لیکن اِس قسم کی "بہار ایجادیوں" کے لئے بھی ذوقِ سلیم نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے جس سے باہر قدم رکھنا ناقابلِ معافی نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ اس حد کو عبور کر کے ہم "خیال بندی" کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر واقعات اور جذبات کی تشریح کے علاوہ خیالی اور وہمی[1] چیزوں کے تجزیے سے بھی اپنے ذوقِ تحلیل کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ تجرید جو مابعد الطبیعیات کے بازار کا خاص سکّہ ہے یہاں نہایت کثرت سے رائج ہے۔ بیدلؔ کے یہ چند اشعار دیکھئے ؎

تماشِ رنگ زبس بے حجاب می بافند   برُوئے گل ز دریدن نقاب می بافند

چشم وا کردم بجوشش اما بہ آغوشِ شرار   غوطہ خوردم در دلِ خوابِ فراموشِ شرار

نہ غبار است کزیں دشت پر افشاں برخاست   نگہے بالِ تماشا زد و مژگاں برخاست

رنگِ طاقت سوخت اما وحشت آغازم ہنوز   چشم بر خاکستر بال است پروازم ہنوز

شبنمِ رم طینتم، بیدلؔ گر افسردم چہ باک   می زند بر یک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز

خیال بندی کے یہ تمام خصائص غالبؔ کے دَورِ اوّل میں موجود ہیں مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی رنگیں یاد سے میری حسرتِ فراق کی زینت ہے اور اس مضمون کو ادا کرنے میں واقعی اور خیالی چیزوں کو بلا تکلّف ملا دیتا ہے۔ ؎

کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس   رنگِ ز نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

---

[1] "خیالی" اور "وہمی" سے متخیلہ کی دو مختلف کیفیتیں متصور ہیں۔ "خیالی" چیزیں وہ ہیں جن کے متعلق اگرچہ خارجی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن محسوسات کی جمع و تفریق سے ہم ان کے تصوّر تک پہنچ سکتے ہیں جیسے خون کی بارش۔ ساکن آبشار وغیرہ۔ وہمی چیزیں بھی خارج میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ کم و بیش انسان کے قوائے فکریہ کی تخلیق ہیں جیسے مہرگیا، عنقا وغیرہ۔ خیالی چیزیں مدرک بہ حواس اور وہمی چیزیں مدرک بہ عقل ہیں۔

اس کے ساتھ بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے : ؎

دریادِ عمرِ رفتہ دلے شاد میکنم　　رنگِ پریدۂ بہ خیال آشیانہ ایست

دراصل اس زمانے میں غالب کا کلام مضامینِ خیالی سے بھرا پڑا ہے اور تقریباً ہر شعر اسی طرزِ بیان کی ایک پیچیدہ گتھی ہے صرف چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

تماشا کردنی ہے انتظارِ آبادِ حیرانی　　نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرشِ محفلہا

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع　　پائے خوابیدہ یہ دل جوئیِ شبگیر آوے

پرورشِ نالہ ہے وحشت پرواز سے　　ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

بہارِ حیرتِ نظارہ سخت جانی سے　　حنائے پائے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے

خیال بندی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی خیال کے بیان میں متعدد تشبیہات اس طرح مربوط کر دی جائیں کہ بغیر کاوش کے مطلب حل نہ ہو۔ یہ شعر دیکھئے ؎

بیدل زجوشِ آبلہ ام در رہِ طلب　　گوہر فروش شد صدفِ گوشِ نقشِ پا

اسی طرح غالب کہتا ہے ؎

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی　　برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں پہلے لالے سے تشبیہ لی ہے اور پھر خود لالے کو ایک مسافر سے مشابہ قرار دے کر تشبیہ در تشبیہ پیدا کی ہے جو خیال بندی کا طغرائے امتیاز ہے۔

خیال بند شعرا صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے تخیلی اندازِ بیان کی بنیاد وہمی و خیالی چیزوں کے تجزیے پر رکھیں۔ بارہا یہ تجزیہ حسن سی حسی مناسبت پر مبنی ہوتا ہے۔ عہدِ اورنگ زیب میں خیال بندی منتہائے عروج پر تھی۔ شیر علی خاں لودھی نے اس زمانے میں خیال بند شعرا کا جو تذکرہ مرتب کیا اس میں خیال بندی کی تعریف یہ کی ہے۔ " دو ایسے کلمات بالاشتراک لانا جن میں سے ایک حقیقی ہو اور ایک مجازی۔ دونوں سے (بہ لحاظِ حقیقت و مجاز) دو مفہوم مترشح ہوں اگرچہ دراصل مراد مجازی سے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مجازی کلمے میں کوئی اصطلاح یا لطیفہ یا ضرب المثل ہو"۔ خیال بندی کی اس تعریف کے بعد بہ طورِ تشریح بیدل کا یہ شعر دیکھئے :-

صافِ معنی کرد مستغنی ز دُردِ صورتم　　چوں لطیفے باطنِ من عالمِ آبِ من است

یہاں شعر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے لفظ آب کے دو معنی لینے ضروری ہیں، "صفائی" اور "پانی"۔ غالب کا دورِ اوّل کا ایک شعر ہے ؎

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ　　موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

یہاں شاعر قید خانے کی وحشتِ تنہائی سے مضطرب ہوا۔ مضطرب ہونے کے لئے دوسرا لفظ آتش زیر پا ہونا ہے۔ چنانچہ "آتش زیر پا" کی آتش کی مناسبت سے مصرعِ ثانی پیدا ہوا:۔

بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎

بود سر مشقِ درسِ بیخودی باریک بینیہا زمو انگشتِ حیرانی بہ لب دارند چینیہا

چینی کے برتن میں جو بال آ گیا ہے اس سے باریک بینی مراد لی ہے لیکن چونکہ بال آنا دوسرے لفظوں میں برتن کے ٹوٹنے کو کہتے ہیں اس لئے ٹوٹنے سے درسِ بیخودی کی تعبیر کی ہے۔ اس بیخودی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ برتن میں جو بال آ گیا ہے وہ اس کے لبوں پر انگشتِ حیرت کی مثال بن گیا ہے ؎

اسی انداز میں غالب کا ایک شعر ہے ؎

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

یہاں سینے کو بالکنایہ مکان سے اور دل کو (یا سوراخ دہن کو) روزنِ در سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہوا (یعنی سانس) گذرتی ہے۔ پھر اسی روزنِ در کو زخم سے مماثل قرار دے کر زخم کو خطرناک ثابت کیا ہے اس لئے کہ اصولِ طب کے مطابق جو زخم ہوا دینے لگے وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیغ نگاہ بے حد تیز ہے۔ ان خصوصیتوں کے علاوہ دونوں مصرعوں میں آب اور ہوا کا تقابل بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جب ایک ایک شعر میں خیالات کی اس قدر بھرمار ہو تو مہمل گوئی کی منزل بہت قریب آ جاتی ہے۔ تحلیلی شاعری اور خیال بندی کا انتہائی کمال بلاغت ہے جس طرح ترکیبی شاعری کا انتہائی کمال فصاحت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بلاغت کلام کے وہی نمونے پسند طبع ہوتے ہیں جن میں فصاحتِ بیان کا پہلو بالکل چھوڑ نہ دیا گیا ہو۔ تحلیلی شاعری جب اپنے کمالِ بلاغت سے گرتی ہے تو مہمل گوئی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ترکیبی شاعری انتہائی معراجِ فصاحت تک پہنچنے کے بعد اپنے دورِ زوال میں پھیکے اور بے مغز شعروں پر انحصار کر لیتی ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کی تحلیلی شاعری خیال بندی کی شکل اختیار کر لینے کے بعد بلاغتِ کلام کی اُس منطقی تدریج تک پہنچ گئی تھی جسے اصطلاحِ عام میں مہمل گوئی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحب "مرآۃ الخیال" لکھتا ہے:۔

"زمانۂ حال کے شعراء نے صنعتِ خیال بندی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ یہ مشہور نکتہ کہ اچھے شعر کے معنی نہیں ہوتے۔ خیال بند شعراء کے کلام میں صاف اور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ص ۱۱۲"

جب ادبی دور کا تنقیدی طغرا یہ ہو کہ "شعر خوب معنی ندارد" اس میں بلاغت کی اس تنزل کردہ شکل (مہمل گوئی) کا فروغ پانا باعثِ تعجب نہیں۔ شاعری میں پرجوش منطقیانہ استدلال خیال بند شعرا کا بڑا کارنامہ ہے۔ بیدل اس فن کا بہت بڑا استاد ہے ؎

گر تامل قفس بیضۂ طاؤس شود — در شبستانِ عدم نیز چراغانے ہست

نبضِ جہدم شررِ کاغذِ آتش زدہ است — یک مژہ راہ بعد چشم پریدن رفتم

نام را نقش نگیں ہا بال پرواز ساست — ما ز خود رفتیم اگر پائے طلب در سنگ ماند

لیکن جب ناکافی توضیح بیان کے باعث ہمارا ذہن شاعر کی پُرپیچ دلیل آرائی کے تمام مدارج کا ساتھ نہیں دے سکتا تو شعر مہمل معلوم ہونے لگتا ہے، بیدل کے حسب ذیل دو شعروں کو بے معنی تو یقیناً نہیں کہنا چاہئے لیکن عام انسانی فہم کے لئے ان کے مطلب تک پہنچنا بہت دشوار ضرور ہے

دانہ مارا کے بجنبد بیں خطِ ساغر ریشہ کرد — در گرہ از شبنم ما عالمے زنّار داشت

حیرت دمیدہ ام گل داغم بہانہ ایست — طاؤس جلوہ زار تو آئینہ خانہ ایست

یہی شانِ اہمال غالب کے ابتدائی کلام میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ موجود ہے ؎

خطِ نوخیز، نیلِ چشمِ زخمِ صافیٔ عارض — لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ آخر

آغوشِ گل ہے آئنہ، ذرّہ ذرّہ خاک — عرضِ بہار جوہرِ پرواز ہے مجھے

بہ ذوقِ شوخیٔ اعضا تکلّف بارِ بستر ہے — معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

لیکن اس قسم کی مہمل گوئی کے ساتھ بلاغت کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں کہ بعض دفعہ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیدل ہمیں تخلیلی تخیل کی پیچیدگیوں کے شعبدے ہی نہیں دکھاتا، وہ بلاغتِ کلام کا بھی بہت بڑا استاد ہے اور وسیع مضامین کو صناعانہ چابک دستی سے دو مصرعوں میں ادا کر سکتا ہے ؎

دیدۂ انتظار را دامِ امید کردہ ام — اے قدمت بچشمِ من خانہ سفید کردہ ام

تنم ز بند لباسِ تکلف آزاد است — برہنگی ببرم خلعتِ خدا داد است

مستِ عرفاں را شرابِ دیگرے درکار نیست — جز طوافِ خویش دورِ ساغرے درکار نیست

غالب کے ابتدائی دَور میں اس قسم کی ماہرانہ بلاغت کی جستجو کرنا فضول ہے لیکن اگر غالب کے ایامِ پختگی کے محض اُردو کلام کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غالب نے فنِ بلاغت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اس لحاظ سے وہ اُردو کے تمام قدیم و جدید شعرا کا سرتاج ہے۔ مثلاً غالب کا یہ بظاہر سیدھا سادھا شعر ملاحظہ ہو ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہؤا!

اِن چند الفاظ میں حسب ذیل نکات مرکوز ہیں:۔

(۱) خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کا بھلا ہوتا ہے۔

(۲) نمرود کی پرستش باعثِ عذاب ہے۔

(۳) میں نے تمام عمر خدا کی عبادت میں بسر کردی۔

(۴) اور ہمیشہ اُمید یہ رکھی کہ اس میں میرے لئے فلاح کی کوئی صورت پیدا ہو گی۔

(۵) انجام کار مجھے مایوسی ہوئی۔

(۶) اور میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے عمر بھر جس کی پرستش کی شاید وہ خدا نہیں، نمرود کی ذات تھی کیونکہ نمرود کی پرستش ہی اس قدر لاحاصل ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نکتہ طرازی کی توقع بارہ پندرہ برس کے کسی لڑکے سے نہیں کی جاسکتی۔ پھر بھی نسخۂ حمیدیہ کے بعض اشعار جو غالباً دورِ اوّل کے لکھے ہوئے ہیں یقیناً اس پائے کے ہیں کہ انہیں مہمل گوئی کا نام دینا ظلم معلوم ہوتا ہے ؎

خاک بازیٔ اُمید کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بہ خندہ وا پایا

اسدؔ کو بُت پرستی سے غرض دردآشنائی ہے — نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دل جمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

اب خصوصیاتِ بیان میں صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ خیال بندی کی مخصوص تشبیہ ہے۔ اسے انگریزی میں (Conceit) کہتے ہیں۔ اُردو میں اس قسم کی تشبیہات کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی لیکن اگر انہیں بدائعؔ (واحد = بدیعہ) کا نام دے دیا جائے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی ادب میں بھی خیال بندی کی شاعری (جسے وہاں Metaphysical Poetry کہتے ہیں) سترھویں ہی صدی کے قریب نمودار ہوئی۔ تقریباً نصف صدی کے فصلِ زمانی سے فارسی اور انگریزی ادب دونوں میں جلیل القدر خیال بند شعراء کا ظہور ہؤا۔ انگریزی شاعری میں جان ڈن (John Donne) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں بیدلؔ کو۔ مگر اس اتفاق سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں خیال بندی کا ظہور اُس وقت ہؤا جب تمام ملک میں ایک شدید مذہبی احساس کا دَور دَورہ تھا۔ شاید مذہب کے پیدا کئے ہوئے تحلیلی شعور کو اس کیفیت سے کچھ تعلق ہو۔ بہرحال دونوں ملکوں میں خیال بند شعراء کا یہ قاعدہ تھا کہ اپنے استعارات و تشبیہات کی تمام جزئیات کو سرمشق تحلیل بناتے تھے۔ اسی طرز کی تشبیہ کو ہم نے یہاں بدیعہ کا نام دیا ہے۔ جب شاعر پیشِ نظر چیز کو کسی بظاہر غیر متعلق چیز سے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ دیتا ہے اور پھر اُس اصل چیز (یعنی مشبہ) کو نظر انداز کر کے، مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ ہی کو اصل موضوعِ کلام قرار دے لیتا ہے یا اس تشبیہ کا تجزیہ اس طریقے پر کرتا ہے کہ اُس کا خطاب تخیل کے بجائے انسانی فہم سے ہو جاتا ہے، اُس وقت وہ بدیعہ نگاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیدلؔ کے یہ دو شعر مثال کے طور پر دیکھئے ؎

اشکِ شمعے بود یک عمر آبیاردانہ ام — سوختن خرمن کند از حاصلِ پروانہ ام

خجلتِ سجدۂ خاکِ درِ او کرد مرا — آں قدر آب کہ سامانِ وضو گردیدم

دورِ اوّل میں غالب کی تشبیہ کا انداز بیدل کی بدایعہ نگاری کا انداز ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ — اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

ایک اور نسبتۃً صاف شعر ہے ؎

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید — مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

غالب کے ان فارسی اشعار میں بھی بیدل کی بدایعہ نگاری کا اثر نمایاں ہے ؎

در ہجر طرب پیش کند تاب وتبم را — مہتاب کفِ مار سیاہست شبم را

محتشم زادۂ اطرافِ بساطِ عدمیم — گوہر از سیفۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

بدایعہ نگاری کے ساتھ علوِ خیال کا بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ علوِ خیال سے عام طور پر یا تو یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کے فکر کا موضوع زندگی کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں اور یا یہ کہ وہ اپنی تشبیہات سے دو ایسی چیزوں کو ہم رابطہ بنا دیتا ہے جن میں بظاہر عظیم الشان فاصلہ حائل ہے مثلاً ناخن بریدہ کو اشارۂ ابرو سے تشبیہ دینا دو قطعاً بے تعلق چیزوں کو باہم منطبق کر دیتا ہے۔ دراصل شعر کا آدھا لطف تشبیہ میں ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دو بظاہر بے تعلق چیزوں میں کسی گہرے اندرونی ربط کا انکشاف۔ شاعر اس انکشاف کے ساتھ خوشگوار استعجاب کا احساس جس حد تک شامل کر سکے گا اسی حد تک تشبیہ عالی یا مضمون بلند ہوگا۔ لیکن ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس قسم کے تحسین آمیز انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ طبیعت یا تو بدمزہ ہو جاتی ہے یا شاعر کے تخیّل کی آوارگی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے علوِ خیال اور بدایعہ نگاری میں بہت ہلکا سا پردہ حائل رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بدائع طرازی کی انتہائی غیر متناسب صورتوں کے ساتھ انتہائی بلندیٔ خیال کے نمونے بارہا شریک ہو جاتے ہیں بیدل اور غالب کے بدائع میں مضحکہ خیزی کے بجائے طبیعت کی بدمزگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میر کے کلام میں بھی بدایعہ نگاری نے سر نکالا ہے لیکن اس کی یہ بلند پروازیاں دردِ سر کے بجائے ہمارے ہلکے سے تبسم کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس بیدل کے بدائع بہت پیچ در پیچ اور عسیر الفہم ہوتے ہیں مشکل معمّوں کی طرح ان کو حل کرتے ہوئے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا غالب کے دورِ اوّل کے اشعار کو سمجھنے میں کیونکہ ان میں بیدل کے بدائع کے ساتھ بچوں اور نوعمر لڑکوں کا وہ روایتی شوق بھی منسلک ہو گیا ہے جس کی تشفی صرف پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ہوتی ہے۔

شاعرانہ تخیل کا آخری درجہ یہ ہے کہ تجریدات کو اشیائے حقیقی کے برابر اہمیت دے دی جائے۔ یہی بدایعہ نگاری کی منزل ہے۔ جہاں کیفیات اشیاء کو اشیاء سے منفک کر کے بازیچۂ تجزیہ و تحلیل بنا لیا جاتا ہے۔ ترکیبی شاعر کا انتہائی تنزل محض محاورہ بندی اور تحلیلی شاعر کا انتہائی تنزل محض بدایعہ نگاری ہے۔

حمید احمد خاں

دُعا

لگا آگ سینے میں سوزِ دروں سے
جواں رکھ مرے دل کو جوشِ جنوں سے

مری فطرتِ پاک و بیباک یا رب
نہ آلودہ ہو حبِ دنیائے دوں سے

عطا کر عقابوں کی پرواز مجھکو
کہ ٹکراؤں اس گنبدِ نیلگوں سے

مجھے طاقتِ بالِ رُوح الامیں دے
کہ ہوں پار اس گنبدِ بے ستوں سے

جواں رکھ مری ہمتِ کوہ کن کو
ہیں نہریں مجھے کاٹنی "بیستوں" سے

سکوں مرگ ہے بہرِ فرزندِ آدم
مجھے رکھیو محفوظ مرگِ سکوں سے

سکھاتی ہے یہ رینگنا آدمی کو
بچانا مجھے دانشِ ذو فنوں سے

جسے پڑھ کے بے دین و بزدل ہو انساں
بچا مجھ کو اس علم و فن کے فسوں سے

مرے دل کو رکھ نورِ ایماں سے روشن
رفاقت ہے عشق کے رہنموں سے

یہ ہستی ہے چہرِ حقیقت کا پردہ
مجھے کر دے آگاہ رازِ دروں سے

خدایا ہو باغِ سخن باغِ جنت
کہ میں سینچتا ہوں اسے اپنے خوں سے

سخن سے مرے دے انہیں سرفرازی
جو رہتے ہیں اس بزم میں سرنگوں سے

رلاتی ہے خوں مجھکو ان کی تباہی
جگر پھٹ گیا ان کے حالِ زبوں سے

مئے زندگی بھر دے جامِ سخن میں
تمنا کے خمخانۂ لعل گوں سے

کہ ان تیرہ بختوں کو خورشید کر دوں
چمن زارِ ایمان و امید کر دوں

محمد اکبر منیر

توبہ

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح
چراغِ حسن کی لَو پر مجھے جلا دینا
کسی نگاہ سے کچھ بجلیاں گرا دینا
مروتم آتشِ رخسارِ سُرخ میں جل کر
کروں جو بادہ کشی تو یہ بد دعا دینا
کسی حسین کے جادو فروش زانو پر
تھپک کے نیند قضا کی مجھے سُلا دینا
گریں جو ساقیٔ مہ وش کے نرم ہونٹوں سے
انہیں حسین گلوں میں مجھے دبا دینا
مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن
تو آبِ خوشۂ انگور سے بجھا دینا
اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح

الطاف مشہدی

گلچیں اور شاعر

ایک ہی سُندر پھول ہے جس سے دونوں اُلفت کرتے ہیں
درشن کے میٹھے امرت سے نین کٹورے بھرتے ہیں
آہ پر اس پر بھی دونوں کا رستہ نیارا نیارا ہے
گلچیں کو تن اُس کا اور شاعر کو درشن پیارا ہے

تاجور سامری لائل پوری

گلشنِ تصوّر

جنّت کا ایک منظر

جنّت میں ایک پہاڑی ندی کے کنارے
طُوبیٰ کی ہری بھری شاخوں کے نیچے
ایک نازک مزاج حسینہ
بیٹھی رو رہی تھی
نہ جانے کیوں ؟

فریاد

بچالے کوئی مجھے بچالے
وہ جس سے میں شادی کرنا نہیں چاہتی
وہ مہربان اپنے بے اندازہ احسانوں کا
جال پھیلا کر مجھے اسیر کر رہا ہے

اُلوؤں کی محفل

نصف شب کے قریب
جب چاند آسمان سے ذرا نیچے اُتر کر
چمک رہا تھا
کھنڈروں میں اپنے اپنے درخت پر بیٹھ کر
چند معتبر اُلّو عقلمند انسانوں کا مضحکہ اُڑا رہے تھے
وہ ہنستے تھے کہ یہ بے وقوف انسان
جسے عقل کہتے ہیں وہ سراسر بے عقلی ہے
اور جسے بے عقلی کہتے ہیں وہ عین دانشمندی

کانے کے آنسو

میں نے اپنے نوکر کو دیکھا
جو باورچی خانے میں چھپ کر
ایک نوکرانی کے لئے
اپنی ایک ہی آنکھ سے رو رہا تھا

چمگادڑوں کی جنگ

رات کو دو چمگادڑیں کیکر کے درخت کی
سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر
اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھیں
کہ ان کی لڑائی ہوگئی
ایک نے دوسری سے کہا
تو کیوں "اُن کا" راہ دیکھ رہی ہے
اپنا منہ تو دیکھ جو چاند کی طرح سیاہ ہے !
دوسری نے جواب دیا "چپ ری چپ، تیرا رنگ کب
کوّے کی طرح سفید ہے ؟"

مہدی علی خاں

کھڑکھڑاتا پتہ

سرسراتی ہوئی آئی چمنستاں میں ہوا
آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا!

بین کرنے لگیں مسرور ہوائیں افسوس
دم بخود ہوگئیں پُرکیف فضائیں افسوس

فاختہ کے دلِ افسردہ میں اِک ہُوک اُٹھی
پھُول مُرجھا گیا کمُلا گئی معصُوم کلی

تیتری روتی ہوئی صحنِ گلستاں سے گئی
درد کا راگ سنانے لگی محزوں ندی
آہ سُوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا!

مہدی علی خاں

غزل

رحمت کو اُن کی جوش میں لانے کی دیر ہے
یعنی سرِ نیاز جُھکانے کی دیر ہے

پینے کی دیر ہے، نہ پلانے کی دیر ہے
ساقی کے بس نگاہ اُٹھانے کی دیر ہے

پروانے آہی جائیں گے کھنچکر بہ جبرِ عشق
محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

آنکھوں میں دم ہے، آخری ہچکی کا وقت ہے
او بے نیاز! بس ترے آنے کی دیر ہے

خود مضطرب ہیں بادہ و ساغر کی جھلکیاں
ساقی کی سمت ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار
سب آچکے ہیں، آپ کے آنے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں، تو اِس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

اُن کے غرورِ حُسن کو رحم آہی جائے گا
لب تک حدیثِ شوق کے آنے کی دیر ہے

چلمن کی بندشوں سے وہ شاید نہ رُک سکے
ماہر کے صرف شعر سُنانے کی دیر ہے

ماہر القادری

آنگی

مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی، آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیر رہے تھے اور اُن کے قریب چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ "چیلیں!" اُس نے ہانپ کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ اب کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا، چیلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں، اُس نے دل میں سوچا، گدھ، کوّے، چیلیں، انسان، ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، اسی طرح سوچتا ہوا، عالمِ حیوانات کی خصوصیات کے متعلق مختلف نظریے قائم کرتا ہوا وہ بہت سا راستہ طے کر گیا، کئی جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں، کئی جگہ اُونچی گھاٹیاں تھیں جن کے دامن میں کھڑے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں، مگر جب وہ گھاٹی کی چوٹی پر پہنچتا، تو بادلوں کا محل یکایک اُوپر اُٹھ کر آسمان میں معلق ہو جاتا، اس دُنیا میں کتنا دھوکا ہے، مسافر کے تخیل نے اب دوسری پگڈنڈی اختیار کی، مہاتما بدھ نے ٹھیک کہا تھا، قدرت ایک سراب ہے، اُس نے پھر نگاہ اُٹھا کر دُور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ سپید، براق، چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے، اور چاروں طرف جمنا کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا، ان مرمریں محلوں کو کس شاہجہاں نے بنایا ہے؟ اور کس محبوب کی یاد میں؟

مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دُور نکل گیا، اب ہوا میں خنکی سی آگئی تھی اور سُورج مغرب میں جا رہا تھا، سامنے پہاڑوں پر صنوبروں کے خاموش جنگل کھڑے تھے جن کا گہرا سبز رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا ارغوانی سا ہو رہا تھا، یہ رنگ آخر ہے کیا؟ نیلا، پیلا، سبز، ارغوانی، اور پھر ایک ہی قوسِ قزح میں ساتوں رنگ، یا شبنم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوسِ قزح، عجیب بات ہے، یہ کیسی دُنیا ہے، میں کہاں جا رہا ہوں، اور وہ گاؤں ابھی تک کیوں نہیں آیا؟

وہ کاندھے پر پڑے ہوئے جھولے کو درست کر کے اپنی چھڑی کو زمین پر ٹیک کر راستے میں کھڑا ہو گیا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، خاموشی، گہری خاموشی، اور پھر یکایک گھنٹیوں کی پرشور صدا، اُسے یوں معلوم ہوا کہ لاکھوں مندروں اور کلیساؤں کے گھنٹے ایک دم جھنجھنا اُٹھے ہیں، مسافر کا خیر مقدم کرنے کے لئے اُن کی آواز نے وادی کے خاموش طلسم کو توڑ دیا، یہ آواز بڑھ کر فضا میں پھیل گئی۔ اُوپر اُٹھتے ہوئے بادلوں سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوئی، اور پھر گھوم گھوم کر مغرب کی سمت سے آتی ہوئی معلوم ہوئی، مغربی موڑ پر سے بھیڑوں، بکریوں، گایوں، بھینسوں، مینڈھوں کا ایک ریوڑ نکل رہا تھا، مسافر راستہ چھوڑ کر ایک طرف اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

ا۔ ہُش، بتی۔ ہا ہا۔ ہُش ہا ہا، نیلتی۔ ہا ہا، بتی، ہی ہی۔

نیلتی اور بتی دو خوبصورت بچھڑیاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں اور بچارے چرواہے کو اُنہیں بلانے

کے ساتھ رکھنے میں بہت دقت محسوس ہو رہی تھی، نیلتی کبھی بھیڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور اُنہیں اتنا پریشان کرتی کہ وہ "بے با" "با بے" کرتی ہوئی تتر بتر ہو جاتیں اور سارے ریوڑ کے نظام کو جو کسی تربیت یافتہ فوج کی باقاعدگی کے ساتھ چل رہا تھا توڑ دیتیں۔ بلی ناچتی کودتی ہوئی بکریوں کے قریب جاتی اور انہیں دھکے مار مار کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھا دیتی۔ بڑی بوڑھی گائیں اور بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے حقارت سے یہ منظر دیکھتی جاتی تھیں، گویا کہہ رہی تھیں "کر لے، دو دن اور عیش، پھر وہ دن بھی آئے گا جب تیری پچھلی لاتوں کو باندھ کر تیرا دودھ دوہا جائے گا، اُس وقت اُچھلنا! پھر تیری چال بھی ہماری طرح بے ڈھنگی ہو کر رہ جائے گی، اب جی بھر کر مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھر لے"

نیلتی اُچھلتی ہوئی مسافر کے قریب آگئی، اُس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی خوش آئند آواز اُس کے ناچتے ہوئے قدموں کے لئے گھنگروؤں کا کام دے رہی تھی، پھر اپنے اگلے پاؤں ٹیلے پر ٹیک کر وہ مسافر کے پاؤں سونگھنے لگی جیسے جنگل میں گھاس کے کسی خوشے کو سونگھ رہی ہو، "نیلتی، ہا! "چرواہی نے اپنی تیلی آواز میں چلا کر کہا، اُس کی آواز بھی ایک گھنٹی سے مشابہ تھی مگر حسین نیلتی نے کوئی پروا نہ کی، شاید شوخی سے، یا شرارت سے، بیچاری چرواہی کو تنگ کرنے کے لئے وہ مسافر کا بوٹ چاٹنے لگی۔

"نیلتی ہا ہا، ہُش، نیلتی ہی! وہ پھر تہدیدی انداز میں چلائی۔

چرواہی مسافر کے بالکل قریب آگئی، اور سونٹے سے نیلتی کو سزا دینے لگی، بیچاری تنگ آگئی تھی، چہرے پر پسینے کے قطرے تھے، اور گال بھی غصے سے تمتمائے ہوئے تھے۔ نیلتی کو ہٹا کر اُس نے نڈر نگاہوں سے مسافر کی طرف تاکا، "راہی کو کو؟" (راہی۔ راہرو۔ کدھر کو جا رہے ہو) اُس نے پہاڑی زبان میں مسافر سے پوچھا۔

مسافر مسکرا دیا۔ پھر کہنے لگا "یہ نیلتی کتنی شریر ہے؟"

چرواہی کے چہرے سے ترشی جاتی رہی، وہ نیلتی کی طرف جو کمبخت مار کھا کر بھی ناچتی، بھاگتی ہوئی جا رہی تھی، پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "ہاں، ابھی تین سال بھی اس کی عمر نہیں"

"ہم —— اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

چرواہی نے ایک لمحہ کے لئے مسافر کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا، دُوسرے لمحہ میں اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا، اُس نے مُنہ پھیر لیا، اور ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی، وہ گایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار رہی تھی۔

مسافر ٹیلے سے اُتر کر چرواہی کے ساتھ ہو لیا، اور اُس کا سونٹا چھین کر کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے آج تمہارا بڑا بھائی تمہارے ساتھ نہیں آیا۔ جبھی تو ریوڑ چرانے میں تمہیں اتنی تکلیف ہوئی ہے۔ اب دیکھو، میں ریوڑ سنبھالتا ہوں اور تم ایک شریف ننھی لڑکی کی طرح میرے پیچھے چلی آؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں، "مجھے بہت دُور جانا ہے، سُورج غروب ہونے کو ہے، کتنی دُور ہے تمہارا گاؤں، یہ ہم واپس کدھر جا رہے ہیں؟"

چرواہی نے ہنستے ہوئے کہا "گاؤں تو تم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اسی لئے واپس جا رہے ہو، وہ دیکھو نا، اُس گھاٹی کے قریب (اُنگلی اُٹھا کر) وہ رہا ہمارا گاؤں۔"

"کیا نام ہے؟ ـــــ"

چرواہی نے جلدی سے جواب دیا "سارُو"

مسافر نے چرواہی کی طرف دیکھ کر کہا "میں کہنے کو تھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا ـــ میرا نام آنگی ہے، (آنگی نے رُکتے رُکتے جواب دیا) ـــ تم کہاں سے آ رہے ہو ـــــ؟"

مسافر جیسے کچھ سُنا ہی نہیں، زور زور سے ریوڑ کو آوازیں دینے میں مصروف ہو گیا:۔

"ہُش ہا ہا، نیلیتی ہا، آنگی ہا ہا، بتی آ ہا۔"

آنگی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی، اچھا تو گویا میں بھی ایک بچھیا ہوں، اوہو ہو ہو ـــــ میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گی۔ یہ راہی (راہرو) کتنا عجیب ہے۔ ۔ ۔ ہا ہا۔ ۔ ۔ تم تو ریوڑ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے، ادھر لاؤ سونٹا!"

اور چرواہی نے ہنستے ہنستے مسافر سے سونٹا چھین لیا۔

مسافر کو سارُو گاؤں بہت پسند آیا، بس کوئی بیس پچیس کچے گھر تھے، سپید مٹی (کھریا) سے لپے ہوئے، ناشپاتیوں، کیلوں اور سیبوں کے درختوں سے گھرے ہوئے، سیب کے درختوں میں پھول آئے ہوئے تھے، کچی، سبز، چھوٹی چھوٹی ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں اور کھیت مکی کے پودوں سے ہری مخمل بنے ہوئے تھے، کیلوں کے ایک بڑے جھنڈ کی آغوش میں گنگناتا ہوا نیلا جھرنا تھا، اور اُس سے پرے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے وسط میں منّو کا قد آور درخت اپنی شاخیں پھیلائے ہوئے کھڑا تھا، اُس کا سایہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ پرے اور نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے تک پہنچ رہا تھا۔ ندی، چھوٹی سی، کسی نازک پتلی سی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی شمال مشرق کے برفیلے پہاڑوں سے آ رہی تھی، اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی، نظر کے آخری نقطے پر وہ دو پہاڑوں کے پتلے کناروں سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جہاں اب سُورج چمک رہا تھا، اُس کے پرے مسافر کا دیس تھا۔ وہ وہاں کب واپس جائے گا؟ کیا وہ کبھی واپس جا سکے گا؟ یہاں کتنا سکون ہے۔ آرام، زندگی، موت، تینوں نے مل کر یہ خوشنما وادی سی بنا ڈالی ہے، یکایک اُس کی آنکھوں کے آگے ریل گاڑی کے گھومتے ہوئے پہیے اُچھلنے لگے، یہ کیسا شور ہے اور کیوں، یہ انسان موت سے بھی بڑھ کر "خاموشی" سے کیوں اتنا ڈرتے ہیں، ہر وقت شور مچاتے ہیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّتے ہیں، کس لئے؟ یہاں کتنا سکوت ہے، امن، حسن، راحت، نیچے پگڈنڈی پر، ندی کے کنارے سے آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھتی ہوئی آ رہی تھی، کاندھے پر پتلی سی سونٹی تھی، لبوں پر ایک بے معنی سا گیت، پاؤں ننگے تھے لیکن چال پر ایک خاموش موسیقیت کا شبہ ہوتا تھا، مسافر نے اپنی کتاب

بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، کاش وہ مصور ہوتا، کتنی خوبصورت تصویر ہے، کتنا دلکش پس منظر، آنگی کے ہلتے ہوئے سڈول مگر مضبوط بازو، اُس کی کمر کا متناسب خم۔ اچھا تو وہ سنگتراش ہی ہوتا، دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں، ورنہ وہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی اصنام گر بھی ششدر رہ جاتے، اتنے میں آنگی نے اُسے دیکھ لیا، عجیب بات ہے، وہ کیوں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی ہے، اُس کے لبوں پر بے معنی گیت کیوں رُک گیا ہے۔ وہ سونٹی سے زمین پر کیا لکھ رہی ہے، ان پڑھ آنگی۔

مسافر نے زور سے آواز دی۔" آنگی!"

آنگی نے ضرور سُن لیا ہے، مگر اُس نے جواب کیوں نہیں دیا، وہ اب اُوپر چڑھ رہی ہے، گھاٹی کے پیچ در پیچ راستے پر سے گزرتی ہوئی ادھر آ رہی ہے، مگر اب اُس کی چال مختلف ہے، بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے، یہ اب اِک نئی تصویر ہے، ایک نیا مجسمہ ہے، وہ جنگل کی دیوی تھی تو یہ دوشیزۂ سحر ہے، اس مجسمہ کی تراش نرالی ہے، اس تصویر کا رنگ نیا ہے، اس گیت کی لَے انوکھی ہے، کاش وہ مغنی ہی ہوتا!

آنگی گھاٹی چڑھ آئی، وہ مسافر کے قریب بیٹھ گئی اور سونٹی کو سبز دُوب پر رکھ کر سستانے لگی، مسافر غور سے اُس زلف کی طرف دیکھنے لگا جو آنگی کے رُخ پر اُتر آئی تھی، یکایک آنگی بول اُٹھی،" تم واپس کب جاؤ گے۔ راہی! جب تم اپنا نام بھی نہیں بتاتے تو پھر مَیں تمہیں راہی ہی کہوں گی، ٹھیک ہے نا؟"

مسافر نے کتاب کے ورق اُلٹتے ہوئے کہا،" ٹھیک ہے اور راہی پھر کوئی اتنا بُرا نام بھی نہیں، بات اصل میں یہ ہے آنگی، کہ میں یہاں اپنی صحت کو بہتر بنانے آیا ہوں، جب اچھا ہو جاؤں گا چلا جاؤں گا"

آنگی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا" کدھر جاؤ گے؟"

مسافر نے نہایت بے پروائی سے داہنا بازو اُٹھا کر کہا" اُدھر جاؤں گا ——"

" تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس دفعہ مسافر نے دوسرا بازو پھیلا کر کہا" اُدھر سے آیا ہوں ——"

آنگی کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں، رُکتے رُکتے کہنے لگی۔" راہی۔ تم —— کتنے عجیب ہو!"

اور راہی دل میں سوچنے لگا" کیا واقعی مَیں ہی عجیب ہوں، کیا یہ منظر عجیب نہیں، یہ خواب کی سی خاموشی، یہ موت کی سی زندگی، یہ آنگی کے رُخ پر بل کھائی ہوئی زلف، کیا سب عجیب نہیں! آنگی کا کُرتا جگہ جگہ سے پھٹا ہؤا ہے اور اُس میں درجنوں پیوند لگے ہیں مگر وہ کس شان سے گردن اُونچی کئے ندی کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے پانیوں کا رنگ اُس کی آنکھوں کی طرح ہی نیلا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں، آنگی کے ہاتھ کتنے مضبوط نظر آتے ہیں، لمبی، مخروطی، مضبوط اُنگلیاں جو ہل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہونگی، ان کلائیوں نے غالباً کبھی چوڑیوں کی کھنک نہیں سُنی، کس قدر عجیب بات ہے، مگر خود میرے ہاتھوں میں نسائیت کی جھلک نمایاں

ہے اور ایک چاقو سے اپنا قلم درست کرنے میں مجھے اتنا وقت صرف کر دینا پڑتا ہے جتنا آنگی کو آدھے کھیت میں ہل چلانے کے لئے ــــ

. . . .

. . . .

کئی دنوں کے وقفے کے بعد مسافر کی آنگی سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا "آنگی، تمہیں اتنے دنوں سے نہیں دیکھا"
آنگی نے جواب دیا "عجیب بات ہے، میں سمجھتی ہوں کہ تم ــــ اتنے دنوں کہیں غائب رہے۔ اب ــــ بہت دن ہوئے تم نے وہ اپنی تاروں والی بنسری (وائلین) نہیں سُنائی، ابھی پرسوں ہی کی بات ہے، ہم سب منّو کے نیچے بیٹھے ہوئے فیروز سے الغوزہ سُن رہے تھے، تمہیں پتہ ہے نا، وہ الغوزہ بہت ہی اچھا بجاتا ہے، کرن کہنے لگی، پتہ نہیں، کیوں آج کل راہی دکھائی نہیں دیتا۔ اُس سے اُس کی تاروں والی بنسری بجانے کو کہتے، کیوں ؟" اتنا کہہ کر آنگی نے مسافر کی طرف دیکھا۔

مسافر کی اُنگلیاں بے چین ہو گئیں، اُس نے اپنا ہاتھ آنگی کے ہاتھ کے اتنا قریب رکھ دیا کہ ایک کی اُنگلیاں دوسرے کو چھو رہی تھیں۔ آہستہ سے بولا "ہاں، درست ہے، میں آجکل لمبی لمبی سیریں کرنے کے لئے گاؤں سے بہت دُور نکل جاتا ہوں، کبھی کبھی اُن منوبروں کے گھنے جنگلوں میں چلا جاتا ہوں"۔

"تمہارا اکیلے جی کیسے لگتا ہوگا ؟"

"اکیلا تو نہیں ہوتا، کبھی کوئی کتاب لے جاتا ہوں، کبھی کچھ لکھتا ہوں، کبھی اپنی تاروں والی بنسری بجاتا ہوں"۔

آنگی نے حیرانی سے مسافر کی طرف دیکھا، "راہی تم کتنے عجیب ہو !"

اُس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔

برسات کے آخری دنوں میں مکّی کی فصل پک گئی، سارُو گاؤں والوں نے منّو کے درخت کے آس پاس بڑے بڑے کھلیان لگائے مکّی کے کھلیان اور پیلی پیلی لمبی گھاس کے ذخیرے، منّو کے قریب ہی تین چار جگہوں پر پتلی سی چھوٹی خود رو گھاس کو چھیل کر گول گول قطعے تیار کئے، انہیں گوبر سے لیپ دیا، پھر اُن پر کھریا مٹی پھیر دی۔ اب ان میں مکّی کے بھٹوں کے انبار جمع کئے اور اُن پر بیلوں کو چکّر دے دے کر چلایا تاکہ دانے بھٹوں سے الگ ہو جائیں کچھ بھٹے تو اِس طرح سے بالکل صاف ہو گئے، مگر بہت سے بھٹے سخت جان نکلے اور بیلوں کے پاؤں تلے روندے جا کر بھی اُنہوں نے مکّی کے دانوں کو اپنے جسموں سے الگ نہ کیا، پھر سارُو گاؤں والوں کی ٹولیاں بنیں، لوگ چاندنی راتوں کو اکٹھے ہو کر قطعوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بھٹوں سے دانے الگ کر رہے ہیں، نیچے بہتی ہوئی ندی کا دھیما سا شور ہے، منّو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور اُس اُداس نغمے کو سُن رہا ہے جو نوجوان کسان اور اُن کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں، پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں، خاموشی سے مکّی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں، ہوا کے نہایت ہلکے ہلکے جھونکے آتے

ہیں اور منّو کا سارا درخت سانسیں لیتا ہؤا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آگ تاپتا ہؤا بوڑھا کسان آہستہ سے کہہ اُٹھتا ہے، اور گاؤں، بیٹا اور گاؤں، پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے، اُسے اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کی بہار یاد آ رہی ہے، زرد زرد شعلوں کی چمک اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرز لرز جاتی ہے، گاتے گاتے گیت کے الفاظ اُس کے مُنہ میں لڑکھڑا جاتے ہیں، اب وہ چُپ ہو جاتا ہے اور آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر مکّی کا ایک بھٹّا بھون رہا ہے۔ نوجوان چرواہیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی یکایک ہنس پڑتی ہیں، نوجوان گڈریئے انہیں کنکھیوں سے دیکھ کر مُسکراتے ہیں، پھر کوئی ہجر کا نغمہ فضا میں گونج اُٹھتا ہے، نوجوان چرواہیوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کر رہے ہیں، یہ مکّی کے دانے کسی تسبیح کے بے شمار دانے ہیں، وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے، اُس آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے جس کا دھوُاں اُٹھ کر سارے معبد کو معطّر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفس روحیں ہیں، یہاں ابدی سکون ہے اور خدا کا رحم!

سارو گاؤں والے مسافر کو ایک عزیز مہمان بلکہ اپنا بھائی سمجھتے اور اُسے اپنی خوشیوں میں شریک کرتے، بھولے بھالے کسان، الھڑ چرواہیاں، ننھے ننھے بچے اُس کے گرد جمع ہو جاتے، مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ، مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ، آنگی اُس کے شانے پر اپنی بانہہ ٹیک دیتی اور دوسری بانہہ سے اُس کی اُنگلیوں میں مضراب کو پکڑ کر کہتی لو، بجاؤ، راہی، اپنی تاروں والی بنسری بجاؤ، یا پھر کھلیانوں کے لمبے لمبے سایوں میں کوئی اُس سے کسی کہانی کی فرمائش کرتا، اُس دُنیا کی کہانی جہاں لمبے لمبے میدان ہیں، بڑے بڑے دریا ہیں، میلوں تک پھیلے ہوئے شہر ہیں، جہاں لوہے کے تاروں پر لکڑی کے مکان قطار بنائے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں کہیں سے کوئی ایک بٹن دبا دیتا ہے اور لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں، آسمان پر اُڑن کھٹولے گھوم رہے ہیں اور نیچے بازاروں میں وہ پریاں محوِ خرام ہیں جن کے لباس تیتریوں کے پروں سے بنائے گئے ہیں۔

اِس طرح مکّی کے کھلیانوں میں کئی چاندنی راتیں گزر گئیں، ایک رات مسافر نے پہلے قطعہ میں فیروز کا الغوزہ سنتے ہوئے محسوس کیا کہ آنگی وہاں نہیں ہے، دوسرے قطعے میں مکّی کے دانوں کو بھُٹّوں سے الگ کرتے ہوئے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر آنگی کہیں نظر نہ آئی، تیسرے قطعے میں مسافر نے ایک دلکش کہانی سنائی جو شہروں کی زندگی کے متعلق تھی، اُس کی نگاہیں آنگی کو تلاش کرتی رہیں مگر بے سُود، چوتھے قطعے میں اُس نے اپنی وائلین کو نکالا اور ایک دلسوز نغمہ چھیڑا، باقی قطعوں سے اُٹھ کر سارو گاؤں والے چوتھے قطعے میں آ جمع ہوئے اور مسافر کی بنسری سننے لگے، اُن کے چہروں پر خوشی تھی اور حیرت بھی ـــــ مگر آنگی کہاں تھی؟

آخر مسافر نے پوچھ ہی لیا۔

ایک نوجوان کسان نے بے پروائی سے کہا، "وہ کھلیان کے اُس طرف بیٹھی ہے، ابھی تھوڑا عرصہ ہؤا۔ اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی گا رہی تھی کہ فیروز کی بہن نے نہ جانے اُسے کیا کہا، کیوں دلشاد تم نے کیا کہا کہ وہ اُٹھ کر چلی گئی اور جھولی میں بہت سے بھُٹّے بھر کر لے گئی، اب اکیلی بیٹھی دانے الگ کر رہی ہوگی، کون مناتا پھرے، کرن تو کیوں نہیں جا کر منا لاتی اُسے"۔

کرن ہنس پڑی، مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کھلیان کے دوسری طرف مسافر نے دیکھا کہ چند مکّی کے بھُٹے زمین پر پڑے ہیں اور اُن کے قریب کھلیان کا سہارا لئے ہوئے آنگی نیم دراز حالت میں پڑی ہے، آنکھیں نیم وا ہیں اور چاند کی کرنوں نے اُس کے سر کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے۔

آنگی !

آنگی !!

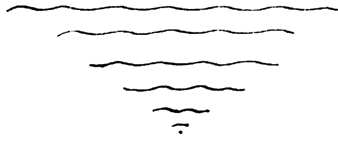
آنگی !!!

مسافر آنگی پر جھُک گیا، اُس نے آنگی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا "کیا بات ہے آنگی ؟"

آنگی اُٹھ بیٹھی، اُس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا اور مکّی کے دانے الگ کرنے لگی۔

آخر اُس نے گھُٹے ہوئے لہجہ میں کہا "آہ، مسافر مجھے یہاں سے لے چلو!" یہ کہہ کر اُس نے سر جھُکا لیا، اور چُپ چاپ رونے لگی۔

مسافر خاموشی سے مکّی کے دانے الگ کرتا رہا، اُس نے آنگی کے آنسو نہیں پونچھے، اُس نے اُسے پیار نہیں کیا، یکایک ایک پرندہ اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے تیر کی طرح سامنے سے نکل گیا، کھلیان کے اوپر دو تین ستارے چمک رہے تھے آنگی کے آنسوؤں کی طرح، اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دُلہن کی سسرال کو روانگی کا گیت گا رہی تھیں، مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے صنوبروں کے جنگلوں کو چیر کر وسیع میدانوں کو ڈھونڈنے لگیں جہاں اُس کا دیس تھا، اُس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیے اُچھلنے لگے۔



مسافر خدا کا شکر بجا لاتا ہے کہ وہ اپنی دنیا میں واپس آ گیا، اپنی تہذیب کی دُنیا میں، کبھی خیال کرتا ہے شاید میں نے غلطی کی، کبھی کبھی اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے بیٹھے خوش فعلیاں کرتے ہوئے اُس کے کانوں میں عجیب عجیب الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔ راہی تم کتنے عجیب ہو، راہی تم کتنے عجیب ہو، راہی۔ تھتے کہ اُس کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے اور اُس کے دل پر ایک عجیب اُداسی چھا جاتی ہے، اور وہ سوچتا ہے کہ شاید کسی نیلے جھرنے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اُس کا انتظار کر رہی ہے، اُس کے پاؤں ننگے ہیں، اُس کی نگاہیں اُداس ہیں، اُس کے بالوں میں سیب کے پھولوں کا گچھا ہے ——!

آنگی !

کرشن چندر

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(ایک دہاتی گیت)

کچھ یاد بھی ہیں وہ دن کہ نہیں جب من کو مرے بھرماتے تھے
جب پریم کی جوت جگاتے تھے جب پریت کی آگ لگاتے تھے

جب بچھتے تھے چرخے آنگن میں
میں کاتتی تھی جب تیجن میں

دیوار کے سائے میں بیٹھے تم پریت کے گیت سناتے تھے
کچھ یاد بھی ہیں وہ دن کہ نہیں جب من کو مرے بھرماتے تھے

پنگھٹ پہ جو پانی بھرتی تھی
ابھی ڈول نہ ہاتھ سے دھرتی تھی

بن کہے ہی تم آجاتے تھے اور میرا گھڑا اُٹھواتے تھے
کچھ یاد بھی ہیں وہ دن کہ نہیں جب من کو مرے بھرماتے تھے

کبھی کھیت سے پھر کر آتے میں
کبھی میلے ٹھیلے جاتے میں

تم کاٹ کے چکّر کتنے ہی مرے آگے پیچھے آتے تھے
کچھ یاد بھی ہیں وہ دن کہ نہیں جب من کو مرے بھرماتے تھے

وقار انبالوی

ستی

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ لپکتے ہوئے شعلے، یہ دھڑکتے ہوئے سینے

یہ لرزتے ہوئے سینے، یہ مچلتی ہوئی رُوحیں، یہ محبّت کے دفینے

یہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، یہ ڈھلکتے ہوئے آنسو

یہ دمکتے ہوئے آنسو ہیں کہ حوروں کی انگوٹھی میں ہیں پارے کے نگینے

یہ لہکتے ہوئے آنچل، یہ کھسکتے ہوئے دامن، یہ سرکتے ہوئے فرغل

کہ سمندر کے کنارے پہ ہواؤں سے تڑپتے ہوئے خاموش سفینے

یہ پریشاں سی نگاہیں، یہ ہراساں سی نگاہیں، یہ غم افشاں سی نگاہیں

یہ تعجب سا لبوں پر، یہ شکایت سی نظر میں، یہ جبینوں پہ پسینے

وہ پھڑکتی ہوئی نبضوں میں قیامت سی در آئی، وہ چمک سی ہوئی پیدا

وہ دمکتے ہوئے "فردوس" میں اک جست لگائی ہے خموشی سے کسی نے

وہ فرشتوں کی قطاریں بھی شعاعوں کے سہارے سے زمیں پر اُتر آئیں

وہ تھرکتے ہیں ستاروں سے پرے نور بھرے بحر میں روحوں کے سفینے

احمد ندیم قاسمی بی۔اے

کلامِ پاک

(تاج کمپنی کی حمائل شریف کو دیکھ کر)

کلامِ پاک! انصاف کا تقاضا ہے اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ جیسی اِس کلام کی رُوح خوبصورت ہے ویسا ہی اس کا جسم اور ویسی ہی اِس جسم کی پوشاک بھی خوبصورت و خوش نُما ہو!

لیکن جس ہستی کا باطن خود خدا نے بنایا ہو انسان کے بس کی بات نہیں کہ اُس کے ظاہر کو اُسی قدر حسین و پاکیزہ بنا سکے۔ پھر بھی ہم خاک کے پُتلے آرزو کے بندے ہیں اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ جس حسین نے ہمارا دل لیا ہے زندگی کی سب رعنائیاں اُس کے قدموں پر نثار کر دیں۔

یہ حمائل جو میرے سامنے ہے اس کا ہر صفحہ رنگوں کی ایک دنیا ہے اور ہر مسلمان جو استطاعت رکھتا ہے اُس کا اپنے ہی دل کی خوشی کے لئے فرض ہے کہ اس کتابِ زندگی کے تاج ایڈیشن کو اپنی خلوت کا سامانِ آرائش بنا کر رکھے۔

کوئی صفحہ کھولو حسن کی طشتری میں حکمت کے موتی بکھرے ہوئے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ———— ہم کو سیدھے رستے چلا

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ———— (یہ) کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے تئیں فراموش کئے دیتے ہو۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ———— اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اُس کو اُس کے ناموں سے پکارا کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ———— مومنو تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔

مُجلّد، مُطلّا، مُنوّر! قسم اوّل کے صفحے کا ایک نمونہ تاج کمپنی لاہور سے مفت طلب کیجئے اور دیکھئے!

بشیر احمد

تدبّر

یہ حکم نافذ ہو چکا تھا کہ مجرم کو قتل کی سزا یاشیکی کے باغ میں دی جائے گی۔ چنانچہ محافظ اس شخص کو وہاں لے آئے اور وہ ایک کھلے ریتیلے قطعہ میں جس کے آرپار عام جاپانی باغوں کی طرح چوکور پتھروں کی دو قطاریں گزرتی تھیں گھٹنوں کے بل بٹھا دیا گیا۔ جب مجرم کی مشکیں کس دی گئیں تو ملازم پانی کا ایک ڈول اور چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھری ہوئی چند بوریاں لائے۔ یہ بوریاں دو زانو بیٹھے ہوئے آدمی کے جسم کے گرداگرد جما دی گئیں اور وہ ان کے درمیان اس طرح پھنس گیا کہ اُس کے لئے ہلنے جلنے کی مطلق گنجائش نہ رہی۔ اس کے بعد افسر آیا اور اُس نے انتظامات پر ایک نگاہ ڈالی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔

یکایک مجرم نے چلّا کر افسر سے کہا "حضور جس جرم کی سزا مجھے دی جا رہی ہے وہ مجھ سے نادانی کے باعث سرزد ہؤا۔ جرم کا موجب میری خلقی حماقت تھی۔ میں ایک جنم جلا کودن ہوں اور کرم ریکھا ہٹ ہوتی ہے، اس لئے لاکھ کوشش بھی کرتا ہوں مگر غلطیوں سے نہیں بچ سکتا لیکن کسی شخص کو محض گاؤدی ہونے کی وجہ سے قتل کر دینا گناہ ہے اور یاد رکھیئے گناہ کا بدلہ مل کے رہتا ہے۔ اگر آپ نے مجھے قتل کیا تو یقیناً آپ کو اس گناہ کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔ اپنی بے گناہی کی وجہ سے یہ سزا میرے دل میں جو غم و غصہ پیدا کرے گی وہ انتقام کی آگ کو بھڑکائے گا۔ اور بدی کا بدلہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا"۔ . . . . .

افسر کو یہ بات معلوم تھی کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں قتل کر دیا جائے جب اُس کے دل میں قاتل کے خلاف شدید ناراضی کا جذبہ موجزن ہو تو اس شخص کی رُوح قاتل سے بدلہ لینے پر قادر ہوتی ہے اس لئے اس نے نہایت شفقت اور ملاطفت سے جواب دیا کہ بیشک مرنے کے بعد تمہیں اختیار رہو گا کہ تم جتنا چاہو ہمیں تنگ کرو لیکن ہمیں اعتبار نہیں آتا کہ جو تم کہتے ہو وہ تم کرنا بھی چاہتے ہو۔ کیا تم اپنے سر کٹ جانے کے بعد ہم سے اپنی شدید ناراضی کا کوئی ثبوت ہمیں بہم پہنچاؤ گے"۔

وہ شخص چلّایا "ہاں ہاں ضرور"۔ . . .

افسر نے تلوار سونت کر کہا "بہت اچھا۔ دیکھو! اب میں تمہارا سر قلم کرنے کو ہوں۔ تمہارے عین مقابل وہ پتھر گڑا ہے۔ جونہی تمہارا سر تن سے جدا ہو اس پتھر کو اپنے دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرنا۔ اگر تمہاری برافروختہ روح نے اس کام میں تمہاری مدد کی تو ہم میں سے بعض یقیناً ڈر جائیں گے . . . . اب بولو کیا تم اس پتھر کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرو گے؟"

وہ شخص پھر نہایت جوش سے چلّایا "میں اس پتھر کو اپنے دانتوں سے چبا ڈالوں گا۔ میں اسے چبا ڈالوں گا — چبا ڈالوں گا!"

اس کے بعد ایک چمک، ایک گڑگڑاہٹ اور ایک بھدی آواز پیدا ہوئی اور جکڑا ہؤا جسم پتھر کی بوریوں پر جھک گیا۔ طرفۃ العین میں بُریدہ گردن سے دو سُرخ فوارے اُبلنے لگے اور ریتے پر گرا ہؤا سر آہستہ آہستہ پتھر کی طرف لڑھکنے لگا۔ پھر دفعتہً اُچھل کر اس نے پتھر کی بالائی

نوک کو اپنے دانتوں میں لیا اور ایک لمحے کے لئے بے تحاشا اس سے چمٹ جانے کے بعد بے حس و حرکت ہو کر نیچے گر گیا۔

. . . .

سب خاموش تھے اور خوف زدہ ملازموں نے افسر کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ رکھی تھی۔ افسر بالکل مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی تلوار قریب ہی آدمی کے ہاتھ میں دے دی جس نے ایک چوبی برتن میں پانی لے اس کو دستے سے لے کر نوک تک دھو ڈالا۔ پھر کئی دفعہ اُس نے تلوار کے پھل کو نرم کاغذ کے ٹکڑوں کے ساتھ پونچھا اور یوں اس واقعہ کی آخری رسم انجام کو پہنچی۔

. . . .

اس واقعے کے بعد متواتر کئی مہینوں تک ملازموں کو مقتول کی بدروح کی بازگشت کا دھڑکا لگا رہا۔ ان سب کو یقین تھا کہ انتقام کی جو دھمکی دی گئی تھی وہ ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی چنانچہ اس مسلسل خوف و ہراس کے باعث وہ آئے دن ایسی شکلیں دیکھتے اور ایسی آوازیں سنتے جن کی کوئی اصل نہ ہوتی۔ بانس کے پودوں میں ہوا کی سرسراہٹ انہیں خوف زدہ کر دیتی اور باغ کے سایوں کی ہلکی سے ہلکی جُنبش بھی انہیں ڈرا دیتی۔ آخر اُنہوں نے باہم بیٹھ کر مشورہ کیا کہ افسر سے کفارہ ادا کرنے کی درخواست کرنی چاہئے۔

جب افسر کے خانساماں نے اُس سے ملازمین کی اس عام خواہش کا اظہار کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس کی قطعاً ضرورت نہیں ...... یہ میں جانتا ہوں کہ ایک مرتے ہوئے آدمی کا جذبۂ انتقام خطرے کا باعث ہو سکتا ہے لیکن موجودہ صورت میں ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

خانساماں نے ملتجیانہ انداز سے اپنے آقا کی طرف دیکھا لیکن بیچارہ اُس سے اِس دل کو دہلا دینے والے اطمینان کا باعث دریافت کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

افسر نے اُس کی مستفسرانہ نگاہ کو پہچان کر کہا "بات بالکل معمولی ہے۔ اُس شخص کی صرف آخری مجرد خواہش ہمارے لئے موجب اضطراب ہو سکتی تھی اور جب میں نے اُسے انتقام کا ثبوت بہم پہنچانے پر آمادہ کیا تو میں نے اُس کے خیال کو انتقام کی خواہش سے ہٹا کر دوسری طرف پھیر دیا۔ وہ اپنے دل میں محض پتھر کو کاٹ کھانے کا بسیط جذبہ لے کر مرا اور وہ اِس مقصد کو پورا کرنے پر قادر بھی ہو گیا لیکن اور کوئی بات اس کی قدرت میں نہیں کیونکہ آخری وقت پتھر کو کاٹنے کے ارادے کے سوا باقی سب کچھ وہ بھول چکا تھا۔ سو آئندہ تمہیں اس معاملے کے متعلق کسی قسم کی تشویش میں نہیں پڑنا چاہئے"۔

واقعی اس کے بعد مقتول کی رُوح نے کسی کو نہ ستایا اور نہ کوئی اَور واقعہ پیش آیا۔

(ایک جاپانی کہانی)

لیفکاڈیو ہرن

(ترجمہ از حامد علی خاں)

محفلِ ادب

اُردو رسائل کی مختصر تاریخ

ہندوستانی زبان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ شرر کا دلگداز لکھنؤ ہے، جو ۱۸۸۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، سب سے پہلا مذہبی و اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق سرسید احمد خاں ہے جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۵ یا ۹۶ء تک نکلا، سب سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد حیدرآباد دکن ہے جس کے اڈیٹر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے، یہ ۱۸۷۴ء میں نکلا تھا اور سب سے پہلا تحقیقی و تاریخی رسالہ حسن ہے، جو حیدرآباد میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک جاری رہا، نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ اس کے اڈیٹر تھے، اور ہر قسم کے علمی، ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ علی گڑھ کا معارف ہے جس کے اڈیٹر وحید الدین سلیم اور نواب محمد اسمٰعیل خان تھے، یہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا۔

پچھلی صدی کے یہی مایۂ ناز رسالے تھے، جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے، لیکن نئی صدی اپنے ساتھ بہت سے نئے ساز و سامان لائی، نئی تعلیم کی پود اب بڑھ کر جوان ہو چکی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں سر شیخ عبدالقادر کی اڈیٹری میں لاہور سے مخزن نکلا۔ آج کے ادھیڑ اور بوڑھے اُس زمانہ کے نوجوان تھے، سر اقبال، میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، اعجاز حسین، علمدار حسین، سید حسرت، مولانا شروانی، سید علی محمد شاد، وغیرہ مضمون نگار تھے، مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میری عمر کا سب سے پہلا مضمون "وقت" اسی میں شائع ہوا تھا، یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نئی تعلیم کے نوجوانوں کو ملکی ادب کے کام میں لگایا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں سید حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اُردوئے معلّٰی نکالا، جس میں ادبی اور سیاسی مضامین کی گنگا جمنی ہوتی تھی، اس زمانہ میں علی گڑھ منتھلی میگزین کو میر ولایت حسین ایڈٹ کرتے تھے، اور وہ کالج کے بجائے ملک کا رسالہ تھا، نئے نوجوان اس میں مشقِ سخن کرتے تھے، اس کے نوآموزوں میں میرا نام بھی داخل ہے، ۱۹۰۳ء میں دکن کے اُفق سے مولوی ظفر علی خاں کا دکن ریویو اور افسانہ طلوع ہوا۔ ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے الندوہ نکلا، جو روشن خیال علماء کا آرگن تھا، مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اس کے اڈیٹر تھے، ۱۹۰۴ء ہی میں زمانہ کا آغاز ہوا جو منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں اب تک جاری ہے، منشی نوبت رائے نظر کا خدنگِ نظر بھی ۱۹۰۴ء کی یادگار ہے۔

اس کے بعد انڈین پریس الٰہ آباد سے ادیب ۱۹۰۸ء میں، لکھنؤ سے الناظر ۱۹۰۹ء میں، کرم آباد سے ظفر علی خاں کا پنجاب ریویو ۱۹۱۰ء میں، لکھنؤ سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر ۱۹۱۱ء میں، آگرہ سے دلگیر اکبر آبادی کا نقاد ۱۹۱۳ء میں، حیدرآباد سے ہوش بلگرامی کا ذخیرہ ۱۹۱۵ء میں، اعظم گڈھ سے معارف ۱۹۱۶ء میں، چکبست کا صبحِ اُمید لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں نکلا، اور اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے اُردو کے جس کثرت سے رسالے نکلے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں، اور جس کی وسعت پورے ملک کو محیط ہے، پنجاب میں ہمایوں، دہلی میں جامعہ اور شاید یوپی میں معارف بھی(

ہماری زبان کے معیاری ماہوار رسالے ہیں۔

اُردو کا سب سے پہلا سہ ماہی رسالہ اُردو جو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کا آرگن ہے، ۱۹۲۱ء میں نکلا جو خالص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لئے مشہور ہے، دوسرا سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۲۵ء سے نکل رہا ہے، جو مشرقی علوم و فنون و تاریخ پر محققانہ مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی ایکاڈیمی کا ہندستانی الہ آباد ہے جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان و ادبیات کا خدمت گذار ہے۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے بھی ماہوار رسالے نکلتے رہے اور بند ہوتے رہے، مثلاً کلکتہ سے لسان الصدق ۱۹۰۲ء مولینا ابوالکلام کی اڈیٹری میں اور تنویر الشرق، اور ڈھاکہ سے جادو، جونا گڈھ سے زبان اور شہاب، پونا سے رفیق [illegible] ہائی اسکول پونا، مالیگاؤں ضلع ناسک صوبہ خاندیس سے بیداری۔

مدراس میں سفینہ اور بشریٰ شہر مدراس سے، کوکب بنگلور سے، اور مصحف عمر آباد شمالی ارکاٹ سے ابھی انہیں سالوں میں نکلے اور بند ہوئے، اب آمبور سے مینا نکلا ہے، اور مصحف عمر آباد سے دوبارہ نکلا ہے۔

سفیرِ سخن پشاور سے، میزان الافکار، زبانِ ہند اور ارمغان کراچی سندھ سے، نخلستان ملتان سے، اور لالۂ صحرا بہاولپور سے ۳۰ء سے ۳۶ء تک نکلے۔

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ میں نکلے جن میں نوائے کیمبرج اور نوائے وطن امریکہ قابلِ ذکر ہیں۔

(سید سلیمان ندوی) "معارف"

شہزادہ میرزا مغل

(یہ مضمون خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ۹ر نومبر ۱۹۳۷ء کی شام کو دلی ریڈیو میں سُنایا)

ذرا جی لگا کر سُنئے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی بسائی دلی میں ایک لال قلعہ ہے جو شاہ جہاں کا بنایا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے جنوب میں ایک عجائب خانہ بھی ہے جہاں شہزادہ میرزا مغل کی قلمی تصویر دیوار پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مغل خوب موٹے تازے تھے۔ سینہ چوڑا تھا، کلہ جبڑہ شیر کا سا تھا۔ خوب گنجان بھری ہوئی داڑھی تھی، مغلئی ٹوپی اوڑھتے تھے جس میں شہزادگی کے طرے لگے رہتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں، گردن مضبوط اور لمبی تھی۔ غرض یہ کہ صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ میرزا مغل کسی بڑی فوج کے سپہ سالار ہیں یا کسی ملک کے بادشاہ ہیں۔

میرزا مغل ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری بادشاہ خاندانِ تیموریہ کے فرزند تھے مگر ولی عہدی ان کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ اپنے سب بھائیوں میں بہت زیادہ لائق سمجھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں ولیعہدی اُس کو ملتی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریزیڈنسی سے میل جول رکھتا تھا کیونکہ کمپنی مذکور کو بہادر شاہ کے دادا شاہ عالم بادشاہ نے بکسر کی لڑائی کے بعد ہندوستان کی وزارت دے دی تھی۔ اس لئے ولیعہدی کے مسئلہ میں کمپنی کا بڑا اختیار تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء سے چند مہینہ پہلے بہادر شاہ کے تیسرے ولی عہد میرزا فخرالدین فتح الملک کا ہیضہ سے انتقال ہوگیا۔ تو ولی عہدی کے جھگڑے میں پھر جان پڑی۔ ایک طرف مرزا قویاش کوشش کر رہے تھے، دوسری طرف بادشاہ اور ان کی محبوب ملکہ زینت محل اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے شہزادہ جواں بخت کے لئے سعی میں مصروف تھے شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ ریزیڈنسی دہلی نے مرزا قویاش سے ایک خفیہ قرارنامہ اس مضمون کا لکھوالیا تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی مجھے بہادر شاہ بادشاہ کی ولیعہدی دے گی تو میں تخت نشین ہونے کے بعد اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ شہزادہ کہوں گا اور لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں بہادر شاہ بادشاہ نے جو محل بنوایا ہے اس میں اپنے خاندان سمیت رہا کروں گا اور کمپنی سے ایک لاکھ روپیہ ماہوار جو وظیفہ بہادر شاہ کو ملتا ہے میں اس کے عوض صرف پچاس ہزار روپے ماہوار لیا کروں گا۔

اس عہدنامہ یا اقرارنامہ کی خبر چھپی نہ رہی اور بہادر شاہ اس سے بہت بگڑے اور انہوں نے ریزیڈنٹ کو کہلا بھیجا کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو میں اس کی شکایت گورنر جنرل کو لکھوں گا کیونکہ جو عہدنامہ میرے ادا شاہ عالم سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہوا تھا اس کی شرائط میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی کہ بادشاہ کی اطلاع کے بغیر ولی عہد سے اقرارنامہ لکھوایا جائے، کہا جاتا ہے کہ میرزا مغل کے دوستوں نے ان کو بھی ترغیب دی تھی کہ وہ بھی اپنے بھائی میرزا فخرو ولیعہد کے مرنے کے بعد ولی عہدی کے لئے کوشش کریں مگر انہوں نے انکار کیا اور اپنے باپ بہادر شاہ سے جا کر کہا کہ میرے بھائی میرزا قویاش نے جس مضمون کا اقرارنامہ ریزیڈنسی کو دیا ہے وہ ہم سب بھائیوں کی مرضی کے خلاف ہے اور میں ولی عہدی نہیں چاہتا میرے دشمنوں نے غلط مشہور کیا ہے کہ میں بھی اپنے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ بلکہ میں اپنے چھوٹے بھائی میرزا جواں بخت کی ولی عہدی قبول کرنے کو آمادہ ہوں جس سے بہادر شاہ بہت خوش ہوئے تھے میرزا مغل کی خوراک بہت اچھی تھی یعنی وہ اچھے کھانوں کے شوقین تھے، اُن کے دسترخوان پر چالیس قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے۔ وہ ناشتہ میں ایک بکرے کی یخنی پیتے تھے اور دوپہر کے کھانے میں بھُنے ہوئے پانچ مرغ کھاتے تھے۔ دو سیر بادام کا حریرہ پیتے تھے۔ ایک دُنبہ کا پلاؤ اکیلے ختم کر دیتے تھے۔

میرزا مغل کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ مگدر کی جوڑی کے ایک ہزار ہاتھ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا وہ روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے بڑی کے موسم میں بھی گرم پانی استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کو پنجہ کشی کا بہت شوق تھا۔ میر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد تھے۔ بندوق کا نشانہ بھی خوب لگاتے تھے۔ وہ ہر نشہ سے بیزار تھے۔ اور ناچ رنگ کا شوق بھی اُن کو نہ تھا اور شاعری کے بھی مخالف تھے۔ میرزا غالب کو بُرا کہتے تھے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔

اُن کی مجلس میں ہمیشہ ایسے لوگ جمع رہتے تھے جن کو مغلیہ خاندان کے زوال کا صدمہ تھا۔ کوئی پردیسی مرہٹہ آخر زمانہ میں اُن کا مصاحب بن گیا تھا جو اُن کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔

میرزا مغل اپنے خاندان کی عیاشی اور آرام طلبی کے بہت خلاف تھے اس لئے ہمیشہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسروں کے حالات پوچھا کرتے تھے کہ وہ کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ میرزا مغل نے بھی اپنے رہنے سہنے کے طریقہ کو باقاعدہ بنا لیا تھا۔ نماز کے پابند تھے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر جلدی سو جاتے تھے اور پچھلی رات کو جلدی بیدار ہو جاتے تھے۔ پہلے غسل کرتے تھے، پھر نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، اور صبح کی نماز کے بعد ورزش کرتے تھے۔ پھر دو سیر بالائی اور ایک بکرے کی یخنی کا ناشتہ کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے تھے اور نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے، پھر گھر میں آکر خانگی کاموں کو دیکھتے تھے۔ اصطبل کے گھوڑوں، بیلوں اور اونٹوں کو چارہ دانہ اپنے سامنے دلواتے تھے اور شکاری چیتوں اور بازوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ غرض دن بھر ایک منٹ بھی ان

کا فضولیات میں ضائع نہ ہوتا تھا۔ میرزا مغل کی جسمانی قوت اور پاکیزہ زندگی کے سبب دلی کے پاکباز ہندو مسلمان اور فوجی لوگ سب شہزادوں میں انہی کو پسند کرتے تھے اور ریزیڈنسی بھی میرزا مغل کی نقل و حرکت کو اپنی نظروں میں رکھتی تھی۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو جب میرٹھ سے انگریزی فوج باغی ہو کر دلی میں آئی اور جبراً لال قلعہ میں گھس کر بہادر شاہ کو اپنا سرپرست بنالیا تو بہادر شاہ نے اس فوج کا سپہ سالار میرزا مغل کو بنا دیا اور میرزا مغل نے اس خدمت کو خوشی خوشی قبول کر لیا اور اپنے بھائیوں میرزا ابوبکر اور میرزا خضر سلطان وغیرہ کو فوجی عہدے تقسیم کر دیئے۔

باغی فوج بہت خودسر تھی اور بہادر شاہ کی علانیہ توہین کرتی تھی اور کہتی تھی کہ جس کے سر پر ہم جوتی رکھ دیں گے وہی بادشاہ بن جائیگا مگر میرزا مغل نے ایک ہی ہفتہ کے اندر باغیوں کو ایسا دبایا کہ وہ سب میرزا مغل کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔ اس معاملہ میں میرزا مغل کا مرہٹہ مصاحب بھی اُن کو بہت مدد دیتا تھا۔ وہ ریاست ناگپور کے خاندان سے تھا جس کی ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی نے ضبط کر لی تھی اس لئے وہ انگریزوں کا بہت دشمن تھا اور وہ حکومت کے انتظام کو بھی خوب جانتا تھا۔ جب دلی میں باغی فوج کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں نے انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا۔ وہ بڑی بیرحمی سے انگریزوں اور عیسائیوں اور انگریزی خیرخواہوں کو مارتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ایک سو کے قریب انگریز عورت مرد اور بچے گرفتار ہو کر میرزا مغل کے پاس لائے گئے۔ مرہٹہ مصاحب نے مشورہ دیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے مگر میرزا مغل نے ان قیدیوں کو بادشاہ کے پاس لال قلعہ میں بھیج دیا۔ اور بادشاہ نے ان کو ایک مکان میں نظر بند کرا دیا۔ اور حکم دیا کہ شاہی باورچی خانہ سے ان کو کھانا ملا کرے۔ یہ قیدی بہت دن اس مکان میں نظر بند رہے، مگر باغیوں نے میرزا مغل اور بادشاہ کو مجبور کرنا شروع کیا کہ ان کو قتل کرنا ضروری ہے۔ بادشاہ کے مشیر خاص حکیم احسن اللہ خاں اور میرزا فخرو ولیعہد مرحوم کے خسر میرزا الٰہی بخش اور ملکہ زینت محل نے بادشاہ کو اس ظلم سے روکا اور کہا کہ انگریز پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کی مدد لے کر آنے والے ہیں اور یہ باغی اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ آپ ان انگریزوں کی حفاظت کریں گے تو انگریز آپ کا احسان مانیں گے۔ اس لئے بہادر شاہ نے عرصہ تک ان انگریزوں کو قتل سے بچائے رکھا لیکن جب باغی فوج نے حکیم احسن اللہ خاں کا گھر لوٹ لیا اور بہادر شاہ سے مطالبہ کیا کہ ملکہ زینت محل کو ہمارے حوالہ کیا جائے کیونکہ وہ اپنے بیٹے جواں بخت کی ولیعہدی کی وجہ سے انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں تو بہادر شاہ مجبور ہو گئے اور اُنہوں نے کہہ دیا کہ قیدیوں کے معاملہ میں تم جیسا مناسب جانو کرو۔ مگر خفیہ طور سے میرزا مغل کو لکھا کہ انگریز قیدیوں کو قتل نہ کرنا۔ بادشاہ نے پنسل سے یہ رقعہ لکھا تھا اور بسنت نامی ایک شاہی مصاحب یہ خط لایا تھا لیکن بسنت نے وہ رقعہ میرزا مغل کو نہ دیا اور مرہٹہ مصاحب کے اشارہ سے زبانی کہہ دیا کہ حضور بادشاہ سلامت نے حکم دیا ہے کہ انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔

میرزا مغل نے یہ حکم سُنا تو مجبوراً دیوانِ خاص لال قلعہ کے سامنے ان قیدیوں کو لا کر کھڑا کیا اور بادشاہ سے آخری حکم منگایا۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت بھی وہی بسنت پہرہ پر تھا جو جھوٹ موٹ محل کے اندر گیا اور کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور کہا کہ جہاں پناہ نے حکم دیا ہے کہ سب قیدی قتل کر دیئے جائیں حالانکہ بہادر شاہ اس خیال میں تھے کہ میں میرزا مغل کو تحریری حکم بھیج چکا ہوں کہ قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ چنانچہ اپنے مقدمہ کے وقت جو غدر کے بعد لال قلعہ میں ہوا تھا بہادر شاہ نے خود بیان کیا تھا کہ میں نے قیدیوں کو بچانا چاہا تھا مگر بسنت نے غلط بیانی کر کے قتل کرا دیا۔ القصہ جب بسنت نے بادشاہ کا آخری حکم سنایا تو میرزا مغل نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور باغی فوج نے انگریزوں کو قتل کر دیا۔ جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔

آخر جب انگریز پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کی فوج لے کر دلّی پر آئے اور شمالی پہاڑی پر مورچے لگائے تو میرزا مغل نے بھی کشمیری دروازہ پر مورچہ بندی کر کے مقابلہ شروع کیا۔ اسی اثنا میں بریلی کا ایک سالار باغی ہو کر دلّی میں آیا جس کے افسر جنرل بخت خاں نامی تھے۔ جنرل بخت خاں وہابی عقاید رکھتے تھے اور بڑے عقلمند افسر تھے ان کے دلّی میں آتے ہی بادشاہ نے ان کو لارڈ گورنر کا خطاب دے کر تمام فوجی اختیارات دے دیئے یہاں تک کہ میرزا مغل کو بھی بخت خاں کا ماتحت بنا دیا میرزا مغل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور ان کے مصاحبوں خصوصاً مرٹھ مصاحب نے ان کو بخت خاں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ منشی جب علی نامی جگراؤں ضلع لودھیانہ کے ایک شخص انگریزی نوکر تھے اور بڑے توڑ جوڑ کے آدمی تھے انہوں نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعہ میرزا مغل کو بخت خاں سے جُدا کرنے کی تدبیریں شروع کیں۔ یہاں تک کہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بخت خاں نے ایک آخری حملہ کا نقشہ بنایا۔ خود کشمیری دروازہ کے مورچہ کی طرف فوج لے کر گیا اور میرزا مغل کو اجمیری دروازہ کی طرف سے پہاڑی کی پشت پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا کہ سبزی منڈی کی طرف سے انگریزی فوج کی پشت پر جاؤ تاکہ ہم ان کو محاصرہ میں لے کر ختم کر دیں۔ مگر میرزا مغل سے کہا گیا کہ بخت خاں مغلوں کی حکومت ختم کر کے شیر شاہ افغان کی طرح افغان حکومت ہندوستان میں قائم کرنی چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے آپ کو ایسے مورچہ پر بھیجا ہے جدھر جنرل نکلسن کی فوجی قوت کا زور ہے تاکہ آپ کا یہاں خاتمہ ہو جائے اور بخت خاں مُلک کا مالک بن جائے۔ میرزا مغل نے اس بات کو نہ مانا اور وہ یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ جنرل نکلسن قتل ہو گئے لیکن یکایک میرزا مغل کو خبر دی گئی کہ بخت خاں بھاگ گیا اور انگریزوں کی ساری فوج آپ کی طرف آ رہی ہے اس لئے میرزا مغل اپنی فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف چلے گئے۔ ادھر بخت خاں کو خبر دی گئی کہ میرزا مغل بھاگ گئے اور جنرل ولسن پوری فوج کے ساتھ کشمیری دروازہ کی طرف آ رہے ہیں تو بخت خاں بھی پیچھے ہٹے اور جمنا کے کنارے کنارے فوج کو لے کر ہمایوں کے مقبرہ کے نیچے جا کر ٹھہر گئے کیونکہ بہادر شاہ بھی لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے تھے اور جنرل ولسن کشمیری دروازہ کے راستہ دلّی میں داخل ہو گئے۔

۱۵ ستمبر کو بہادر شاہ جان کی امان کے وعدہ پر میجر ہڈسن کے ساتھ انگریزی قبضہ میں آ گئے مگر میرزا مغل نے اطاعت قبول نہ کی اور وہ ہمایوں کے مقبرہ میں ٹھہرے رہے جنرل بخت خاں اپنی فوج لے کر کہیں چلا گیا اور آج تک معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گیا۔ ۱۶ ستمبر کو میجر ہڈسن پھر مقبرہ ہمایوں میں گئے اور میرزا مغل کو چند شرائط کے ساتھ اپنی حراست میں لے لیا میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر اور میرزا عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان سب کو رتھوں میں سوار کیا گیا اور چاروں طرف انگریزی فوج کے سپاہی چلنے لگے۔ دہلی دروازہ کے قریب جہاں آج کل دلّی کا جیل خانہ ہے اور سڑک کے شرق میں ایک پُرانا دروازہ ہے جس کو خونی دروازہ کہا جاتا ہے میرزا مغل وغیرہ کو رتھوں سے اُتارا گیا اور کہا گیا کہ قیدیوں کو شمار کرنا ہے تاکہ جنرل ولسن کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ میرزا مغل اور سب شہزادوں کو صف باندھ کر کھڑا کیا گیا اور اُن کی گنتی ہوئی پھر میجر ہڈسن نے فوج کو اشارہ کیا جس نے بندوقوں کی باڑ چلائی جس سے سب شہزادے مر کر گر پڑے۔

مولانا ذکاء اللہ صاحب نے (جو اس زمانہ میں موجود تھے) اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ جنرل ولسن نے میجر ہڈسن کو قتل کی اجازت نہ دی تھی مگر میجر ہڈسن کی عورتیں اور بچے لال قلعہ میں قتل ہوئے تھے اور ان کو میرزا مغل سے بدلہ لینے کا جوش تھا اس لئے اُنھوں نے اپنی رائے سے ان کو قتل کر دیا مگر مولانا ذکاء اللہ صاحب اس عام افواہ کی تصدیق نہیں کرتے کہ میجر ہڈسن نے میرزا مغل کے سینہ سے اُبلنے والے خون کا ایک چُلّو پیا اور کہا کہ اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہُوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میجر ہڈسن کو بیشک غصہ بہت تھا اور وہ میرزا مغل کو اپنے بچوں کا قاتل سمجھتے تھے مگر یہ افواہ درست نہیں ہے کہ اُنھوں نے میرزا مغل کا خون پیا نہ یہ افواہ درست ہے کہ میجر ہڈسن نے شہزادوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کئے اور کہا کہ لو یہ تحفہ قبول کرو۔ کیونکہ جنرل ولسن نے جب یہ خبر سُنی تو وہ میجر ہڈسن پر خفا ہوئے کہ اُنھوں نے میرے حکم کے بغیر شہزادوں کو

کیوں قتل کیا۔ تو میجر ہڈسن نے جواب دیا تھا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ان کو رہا کر دیں گے حالانکہ وہ بہت بڑے مجرم تھے اور معاف کرنے کے قابل نہ تھے۔ زندہ رہتے تو بغاوت کی آگ پھر بھڑک اٹھتی۔ غرض اس طرح میرزا مغل کی زندگی ختم ہو گئی اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی لاش کہاں دفن ہوئی لیکن ہندوستانی لوگ خونی دروازہ کو جہاں میرزا مغل قتل ہوئے تھے اس طرح دیکھنے آتے ہیں جس طرح ان کی قبر کو دیکھا جاتا اگر وہ کہیں موجود ہوتی۔

"منادی"

قومی ترانہ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے — ہر رُت ہر اِک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سُہانا کیسا سُندر پیارا دیش ہمارا ہے — دُکھ میں، سُکھ میں، ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے — پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکھشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے — لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں لاکھوں ندیوں والا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سُناتی جاتی ہیں — صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں — کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دُنیا کو اَن دیتے ہیں — چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں — امن و اماں کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے رُوح ہماری جانوں میں — گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں — نانک کی تعلیم ابھی تک گُونج رہی ہے کانوں میں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں — ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سِکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں — بھارت نام کے عاشق ہم ہیں ہم بھارت کے سودائی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(حامد اللہ افسر میرٹھی)

"دین و دُنیا"